مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۸ | جمادی الثانی/رجب ۱۴۳۸ھ | مارچ/اپریل ۲۰۱۷ء | شمارہ ۳-۴

آثار العبادہ
عبادت کے آثار

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ = /۴۰ روپے | زر سالانہ = /۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

آثار العبادہ (عبادت کے آثار)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱......	خطبۂ ماثورہ........................	۹
۲......	تعیین مقصود........................	۹
۳......	رحمت حق........................	۱۰
۴......	شریعت میں ضروری چیز سہل الحصول ہے............	۱۲
۵......	عقل کا مقتضیٰ........................	۱۳
۶......	درجات کمال........................	۱۴
۷......	شریعت وحقیقت........................	۱۵
۸......	حقیقت پرست........................	۱۶
۹......	شریعت کی رحمت........................	۱۷
۱۰......	بے دینوں کا اعتراض........................	۱۸
۱۱......	شبہ کا جواب........................	۱۹
۱۲......	دین میں فرضی تنگی کی دوسری مثال................	۲۰
۱۳......	شریعت میں وسعت کی مثال....................	۲۱
۱۴......	عقل کے استعمال کی حدود....................	۲۱
۱۵......	احکام دینیات پر عقلاء کے اعتراضات کی حیثیت........	۲۳
۱۶......	حکیمانہ جواب........................	۲۴
۱۷......	عاشق کا حال........................	۲۵
۱۸......	بنسبت عقل کے شریعت زیادہ شفیق ہے............	۲۷
۱۹......	صحابہ کا حال........................	۲۸
۲۰......	سوال وجواب........................	۲۹
۲۱......	غیبوبیت وحضور کا فائدہ....................	۳۱
۲۲......	لذت ذکر........................	۳۱

۲۳......	فراق وصل کی حقیقت..........................	۳۳
۲۴......	مقصود رضاء درست ہے..........................	۳۴
۲۵......	حدیث کی تشریح..........................	۳۴
۲۶......	اقسام ذکر..........................	۳۵
۲۷......	رحمتِ شریعت..........................	۳۶
۲۸......	ہر تکرار قابل ملامت نہیں..........................	۳۷
۲۹......	شانِ الٰہی کا مقتضاء..........................	۳۸
۳۰......	عبادت کی حقیقت ومعنی..........................	۳۸
۳۱......	عابد کی تعریف..........................	۳۹
۳۲......	علماء اور حکام کا اتباع..........................	۴۰
۳۳......	صوفیہ کا طبقہ..........................	۴۱
۳۴......	امراء اور ان کے خوشامدی..........................	۴۲
۳۵......	حقیقی علماء وصوفیہ..........................	۴۲
۳۶......	علمِ حقیقی..........................	۴۳
۳۷......	عبادت کی حقیقت اور مواقع..........................	۴۴
۳۸......	عبادت میں کی جانے والی کوتاہیاں..........................	۴۶
۳۹......	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست..........................	۴۷
۴۰......	نادان طبیب..........................	۴۷
۴۱......	گناہوں سے نفرت کا مطلب..........................	۴۸
۴۲......	دوسروں پر لعنت کرنا..........................	۵۰
۴۴......	غیبت سے احتراز..........................	۵۱
۴۵......	اتباع شیخ کی ضرورت..........................	۵۲
۴۶......	گناہوں کی تقسیم وکیفیت..........................	۵۳
۴۷......	بدنگاہی کا اثر..........................	۵۴
۴۸......	مجنوں کا حال..........................	۵۵

۴۹......	عشق مجازی کا نقصان........................	۵۶
۵۰......	عاشقوں کا انجام بد........................	۵۶
۵۱......	عشق نفسانی کی بڑی آفت........................	۵۸
۵۲......	بدنظری کے علاج کی ضرورت........................	۵۹
۵۳......	عشق نفسانی کا علاج........................	۶۰
۵۴......	دل کی توجہ کا علاج........................	۶۱
۵۵......	وساوس کا علاج........................	۶۱
۵۶......	اشکال کا جواب........................	۶۲
۵۷......	تصور شیخ کی حقیقت........................	۶۳
۵۸......	عشق نفسانی کا علاج تدریجاً ہوتا ہے........................	۶۴
۵۹......	اخلاق رذیلہ کے وجود کی حکمت........................	۶۴
۶۰......	میلان نفس........................	۶۵
۶۱......	عاشق نفس پرست کا علاج........................	۶۵
۶۲......	غلو فی الدین........................	۶۶
۶۳......	صرف عقائد کی درستی کرنے والوں کی مثال........................	۶۷
۶۴......	عقائد کے درست نہ کرنے کی غلطی........................	۶۷
۶۵......	وساوس کی حقیقت اور اس کا علاج........................	۶۸
۶۶......	نماز میں حضور قلب کا طریقہ........................	۶۹
۶۷......	مبتدی اور منتہی کے لئے احضار کا طریقہ........................	۷۰
۶۸......	معاملات میں کوتاہی........................	۷۱
۶۸......	لطیفہ........................	۷۲
۷۰......	علماء سے ملاقات کا فائدہ........................	۷۲
۷۱......	نوشیرواں کی فراست........................	۷۳
۷۲......	نوعمر علماء سے ملاقات کا فائدہ........................	۷۳
۷۳......	سوال کرنے کا فائدہ........................	۷۴

۷۴...... قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیمات...................... ۷۵
۷۵...... بھکاری کا حال.............................. ۷۶
۷۶...... ہماری حالت زار.............................. ۷۶
۷۷...... معاشرت کی تعلیم.............................. ۷۷
۷۸...... جاہلانہ رسم ورواج.............................. ۷۸
۷۹...... تعلیم اخلاق.............................. ۷۹
۸۰...... جاہل پیر.............................. ۷۹
۸۱...... صحیح پیر کی علامات.............................. ۸۰
۸۲...... اطلاع واتباع کا اہتمام.............................. ۸۱
۸۳...... مشائخ کو اپنی فکر بھی کرنی چاہیئے.............................. ۸۱
۸۴...... شیخ کامل کی علامت.............................. ۸۲
۸۵...... ضروری تنبیہ.............................. ۸۳
۸۶...... جاہل حکیم.............................. ۸۳
۸۷...... جاہل پیر.............................. ۸۴
۸۸...... شیخ کامل کی شان.............................. ۸۴
۸۹...... طالب صادق بنو.............................. ۸۵
۹۰...... طلب کی ترغیب.............................. ۸۶
۹۱...... فقیری کی تعریف.............................. ۸۷
۹۲...... اہل دل کی صحبت کا اثر.............................. ۸۷
۹۳...... بڑے میاں کا قصہ.............................. ۸۸
۹۴...... اصلاح باطن کی ضرورت.............................. ۸۹
۹۵...... پیر کی اصلاح کا انوکھا طریقہ.............................. ۸۹
۹۶...... بیعت ہونے میں جلدی نہ کریں.............................. ۸۹
۹۷...... خلاصہ وعظ.............................. ۹۰

وعظ

آثار العبادہ

عبادت کے آثار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے مذکورہ وعظ عبادت کے آثار سے متعلق مدرسہ نظامیہ شبلی گنج حیدر آباد دکن میں ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ بروز شنبہ بعد نماز عشاء کرسی پر تشریف فرما ہوکر ۴ گھنٹہ تک ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد چار ہزار تھی، حضرت علامہ ظفر احمد عثانی نے یہ وعظ اور اسکے بعد ہونے والا وعظ اسرار العبادہ دونوں ضبط فرمائے طباعت وغیرہ کے اخراجات عبدالحمید کانپور لیدر ورکس مشن روڈ کانپور اور حاجی محمد یوسف صاحب نے برداشت کئے۔

نوٹ: یہ رسالہ مارچ اور اپریل ۲۰۱۷ء دو ماہ کے لئے طبع کیا گیا۔

خلیل احمد تھانوی

۱۳ نومبر ۲۰۱۶ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَاعۡبُدۡهُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾(۱)

تعیینِ مقصود

یہ ایک آیت ہے سورۂ مریم کی جس کی تلاوت اس سے قبل ایک نہایت مختصر جلسہ بیان میں کی گئی تھی چونکہ مضمون نہایت ضروری تھا اس لئے اس کی شرح کو یہاں بھی کافی سمجھا گیا اور اسی کی تلاوت بھی کی گئی اور اس مضمون کا خلاصہ آیت کے سننے ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ کس قدر ضروری مضمون ہے اور ضرورت بھی ایسی ویسی معمولی نہیں بلکہ اس کا بڑا شدید درجہ ہے جس کے اعتبار سے اس کو اہم کہہ سکتے ہیں۔ اور جو مقصود ہے آیت سے اس کا مادہ خود آیت میں موجود ہے اس لئے مجھے اس کے تعیین کی ضرورت نہیں اور وہ مادہ

(۱) سورۂ مریم: ۶۵۔

کیا ہے وہ عبادت ہے جو فاعبدہ (پس اس کی عبادت کرو) میں مذکور ہے اور اس کا سیاق وسباق اسی کی تمہید کے لئے ہے یا تاکید کے لئے باقی، مقصود صرف فاعبدہ ہے جس میں عبادت کا امر ہے جو عام طور پر اس کے سننے ہی سے مسلمانوں کے ذہنوں میں آ گیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو فاعبدہ کا صیغہ اور ترکیب نہ معلوم ہو مگر یہ تو سب ہی کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت گو ایک شرعی اصطلاح ہے مگر مخفی نہیں ہے۔ (۱) کون مسلمان ایسا ہے جو لفظ عبادت کا استعمال نہ کرتا ہو۔ متعدد موقعوں پر اس کا برابر استعمال کیا جاتا ہے اس لئے آیت کا مفہوم تو سب کے ذہنوں میں متعین ہو گیا ہوگا کہ اس آیت میں عبادت کا امر ہے (۲) اور یہی اس کا خلاصہ ہے۔ جب مقصود کی تعیین ہو گئی تو اس کا ضروری ہونا بھی معلوم ہو گیا کیونکہ حق تعالیٰ اس کا امر فرما رہے ہیں مگر غور طلب بات یہ ہے کہ عبادت کا مفہوم اس قدر تو سہل (۳) کہ روزمرہ کی بول چال میں آتا ہے اور اس قدر ضروری کہ ہر وقت انسان اس کا مکلّف ہے مگر پھر کیوں اس کی طرف توجہ نہیں۔

رحمت حق

اور یہ ایک عجیب رحمت حق ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ عام ضرورت کی ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سہل ہوتی ہے مگر غافلین کی بے قدری سے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ چیز جس قدر سہل ہوتی ہے اسی قدر اس کی وقعت گھٹتی جاتی ہے۔ حالانکہ سہولت واقع میں وقعت گھٹنے کا سبب نہیں بلکہ اور زیادہ توجہ کا سبب ہے کیونکہ سہولت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے طبائع واذہان (۴) میں زیادہ مناسبت پیدا کر دی گئی ہے اور مناسبت عامہ اسی چیز سے پیدا کی جاتی ہے جو اہم ہو جو چیز جس قدر زیادہ اہم ہے

(۱) پوشیدہ نہیں (۲) حکم (۳) آسان (۴) طبیعتوں اور ذہنوں۔

اتنا ہی زیادہ عام ہے یہ ایک قدرتی انتظام ہے اور یہ انتظام بھی عام ہے۔ تکوین کو بھی تشریع کو بھی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لئے ہوا کی ہر وقت کس درجہ ضرورت ہے۔ چنانچہ سانس کی آمدورفت ہی پر قوام عیش کا(۱) دارومدار ہے چنانچہ اگر سانس بند کردی جاوے تو ہلاکت یقینی ہے اور اگر ہوا معدوم کردی جاوے تو سانس بند ہونا یقینی ہے غرض ہوا کا عناصر اربعہ میں شمار ضرورت کے اعتبار سے اشد ہے(۲) مگر باوجود اس کے کتنی ارزاں اور کس قدر عام ہے کہ ہر جگہ ہے اور مفت ہے کہ کہیں بھی نہیں بکتی گو اس کے آلات(۳) بکتے ہوں۔ مگر وہ آلات ہوا پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتے صرف ساکن ہوا کو حرکت دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ مثلاً پنکھا اس کے ذریعہ سے ہوا میں حرکت پیدا کی جاتی ہے جس سے راحت میں زیادتی ہوجاتی ہے مگر نفس راحت پنکھے پر منحصر نہیں وہ محض ہوا سے ہے۔ چنانچہ اگر پنکھا نہ ہو تو یہ اور بات ہے کہ گرمی کی تکلیف ہو مگر ہلاکت نہیں ہوسکتی بخلاف ہوا کے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان ہلاک ہی ہوجاوے۔ بہرحال ہوا چونکہ مدار زندگی ہے اس لئے قدرتی انتظام ہے کہ اس کا ایک کرہ ہے جو ہوا میں بھرا ہوا ہے جس کی نہ قیمت نہ تخصیص بلکہ بے حد تعمیم ہے(۴)۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ جس قدر زیادہ ضرورت کی چیز ہو اسی قدر زیادہ مہنگی اور دشوار یاب(۵) ہو مگر نہیں قدرتی انتظام بالکل اس کے برعکس ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ ضرورت کی ہے اسی قدر زیادہ ارزاں ہے۔ چنانچہ ہوا کی کیفیت آپ نے دیکھ لی پھر ہوا کے بعد پانی کا درجہ ہے۔ سو چونکہ اس کا درجہ ہوا سے کم تھا، اس لئے کہیں کہیں، کبھی کبھی بکتا بھی ہے۔ پھر دیکھئے سب میں کم کام آنے والی چیز جواہرات اور موتی ہیں۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں

(۱) زندگی کا دارومدار ہے (۲) چار عناصر آگ پانی مٹی ہوا جن سے انسان مرکب ہے اس میں سب سے زیادہ ضرورت انسان کو ہوا کی ہے (۳) یعنی پنکھے وغیرہ (۴) بہت عام ہے کہ ہر جگہ مفت میسر ہے (۵) مشکل سے میسر آئے۔

نے شاید زندگی بھر بھی جواہرات دیکھے بھی نہ ہوں گے اور نہ استعمال کئے ہوں گے تو کسی کی ضرورت اس پر اٹکی نہیں۔ مگر باوجود اس کے دیکھ لیجئے کس قدر قیمتی ہیں۔

شریعت میں ضروری چیز سہل الحصول ہے

اور جیسے تکوین میں آپ نے دیکھا کہ ضروری چیزیں ارزاں (۱) ہیں اور غیر ضروری گراں یہی انتظام حق تعالیٰ نے تشریع (۲) میں بھی رکھا ہے۔ چناچہ تشریع میں سب میں ضروری اور اہم اور سب سے بڑا ایمان ہے کہ کوئی وقت اور کوئی حالت ایسی نہیں جس میں یہ ساقط ہوجاوے اس لئے اس میں اس قدر تعمیم ہے کہ اگر زبان سے نہ ہوسکے تو قلب سے ہو اور ایک دفعہ زبان وقلب سے ہوجانے کے بعد اگر غفلت کی وجہ سے قلب میں دوام استحضار نہ ہو (۳) تو مضر نہیں بلکہ ایک دفعہ کا استحضار بھی کافی ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس کی ضد کا استحضار نہ ہو (۴)۔ چنانچہ کوئی شخص ایک مرتبہ ایمان کا اعتقاد کر کے سوگیا یا کسی دوسرے شغل میں منہمک ہوگیا تو ظاہر ہے اس وقت اس کو ایمان کا استحضار نہیں، کیونکہ قاعدہ ہے ''اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَّجُہ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَاحِدَۃٍ عَادَۃً'' (نفس آن واحد میں عادۃً دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) اور عادۃً کی قید اس لئے لگائی کہ نفس کی توجہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف ہونے میں کوئی امتناع عقلی ثابت نہیں ہے (۵) بلکہ عقلاً ایسا ممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ توجہ تام نہ ہو غیر تام (۶) ہو مگر توجہ دو طرف ہوسکتی ہے گو عادۃً ایسا کم ہوتا ہے اس لئے یہ قید بڑھائی۔ تو سوجانے کے بعد یا کسی اور ایسے کام میں مشغول ہوجانے کے بعد جس میں انہماک کی ضرورت ہو کہ اس کو انجام دیتے ہوئے اور کوئی بات ذہن میں نہ رہ سکتی ہو ایمان سے بجائے استحضار کے ذہول محض (۷)

(۱) سستی (۲) شرعی احکام میں (۳) مسلسل اس کا استحضار نہ ہو (۴) اس کی ضد یعنی کفر کا استحضار نہ ہو (۵) کوئی عقلی رکاوٹ ثابت نہیں (۶) مکمل توجہ نہ ہو بلکہ نامکمل توجہ ہو (۷) ذہن سے نکل جاتا ہے۔

ہوجاتا ہے مگر یہ ذہول حکم بالا یمان میں مضر نہیں تو حق تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ ایمان کے استحضار دوامی کو فرض نہیں کیا(۱) ورنہ اگر استحضار دواماً فرض (۲) ہوتا تو نہ سونا جائز ہوتا، اور نہ کوئی ایسا کام کرنا جائز ہوتا جس میں شدید انہماک ہو اس لئے اس میں اس قدر وسعت کردی کہ اگر کسی وقت کسی عذر کی وجہ سے تصدیق باللسان بھی (۳) نہ ہوسکے تو تصدیق بالجنان (۴) بھی کافی ہے اور اگر تصدیق بالجنان ایک دفعہ کرکے پھر ذہول ہوگیا تو یہ بھی کافی ہے کہ ضد تصدیق کا یعنی تکذیب کا استحضار نہ ہو(۵) بس یہ عدم استحضار ضد ہی استحضار ایمان سمجھا جائے گا، حالانکہ ان کی شان عظمت کا تو یہ حق تھا کہ ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی (۶)

عقل کا مقتضیٰ

کیونکہ جتنے تعلقات یا کمالات موجب یادداشت ہوسکتے ہیں وہ سب یہاں بدرجہ اتم واکمل موجود ہیں مثلاً انعام واحسان، حسن وجمال، فضل وکمال، علم وغنا، جود وسخا وعدل وقدرت قہر وغیرہ یہ تمام اوصاف کمال علی وجہ الکمال حق تعالیٰ میں پائے جاتے ہیں جب تمام اسباب موجب ذکر ان میں موجود ہیں تو عقل اس کو مقتضی ہے کہ ذکر بھی ہر وقت ہونا چاہئے کیونکہ جب کمالات احسانات میں کسی آن انقطاع نہیں (۷) تو ذکر وتوجہ میں انقطاع (۸) کیوں ہو اس میں بھی کسی آن انقطاع نہ ہونا چاہیئے۔

یہاں ایک مسئلہ استطراداً بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ آجکل ہر بات میں عقل پرستی کا زور(۹) ہے ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لئے حکم (۱۰) بنایا جاتا ہے

(۱) ہمیشہ ایمان کو پیش نظر رکھنے کو فرض قرار نہیں دیا (۲) ہمیشہ پیش نظر رکھنا فرض ہوتا (۳) زبان سے تصدیق نہ بھی ہوسکے (۴) اعضاء کی تصدیق (۵) یہ بھی کافی ہے کہ اس کی ضد یعنی کفر کا استحضار نہ ہو(۶) ’’ایک پلک مارنے کی مقدار اس محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید وہ توجہ کرے اور تو آگاہ نہ ہو‘‘ (۷) کسی لمحے کی وتعطل نہیں (۸) تعطل (۹) عقل کی پوجا کی جاتی ہے (۱۰) ثالث مقرر کیا جاتا ہے۔

حتی کہ شرعیات میں بھی اور شرعیات سے معاد میں بھی(۱)۔ اور پھر عقل بھی کونسی وہ جو دنیا کے معاملات میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ہے ایسے عظیم فیصلہ کے واسطے۔ اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت خیر خواہ ہے دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دواماً (۲) ضروری ہو ایک ساعت بھی غفلت جائز (۳) نہ ہو جیسا ایک بزرگ غلبہ میں کہتے ہیں ؎

ہرآں کہ غافل از حق یک زماں ست   در آندم کافراماں نہان ست (۴)

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے یعنی مومن کامل کے مقابل اور کامل بھی کیسا جو اکملیت کے درجہ پر پہنچا ہوا ہو۔

درجات کمال

کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک اکمل کا۔ اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد میں غفلت کرے اُسے اضافۃً کافر کہدیا ہے اس سے حقیقی و فقہی کافر مراد نہیں غرض غلبہ حال کا جو اقتضا ہے کہ استحضار دواماً ہو عقل کا بھی وہی اقتضا ہے تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل ہی حکم ہوتی تو وہ تو سب کو عاصی (۵) قرار دیتی شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کو ذہول (۶) کی اجازت دے دی اور عدم تصدیق کو بھی

(۱) آخرت کے معاملات میں بھی (۲) مستقل طور پر ضروری ہیں (۳) ایک لمحہ کی غفلت بھی جائز نہیں (۴) ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑے زمانہ میں بھی غافل ہے اس وقت مومن کامل نہیں ہے'' (۵) گناہگار (۶) تھوڑی سی غفلت۔

جب کہ تکذیب نہ ہو تصدیق(۱) کا قائم مقام کردیا۔ اب بتلایئے عقل زیادہ خیر خواہ ہوئی یا شریعت مقدسہ یہ تو ان عقل پرستوں کو خطاب تھا جن پر سائنس کا غلبہ ہے۔ اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں۔

شریعت وحقیقت

اسی طرح ایک اور جماعت ہے جو حقیقت کو شریعت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ شریعت اور ہے حقیقت اور ہے میں ان کو بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ جس شریعت کی وہ جڑیں اکھاڑتے ہیں وہی ان کی خیر خواہ ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اگر حقیقت محضہ کو حکم بنایا جاوے(۲) تو زندگی تلخ اور زیست وبال اور حرام ہوجائے(۳) مثلاً آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز میری ہے اور یہ زید کی اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو نہ آپ کی ہے نہ زید کی کیونکہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شئے خداست ایں امانت چند روزہ نزد ماست(۴)

زید وعمر کی طرف محض مجازی نسبت ہے، مگر شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے اس ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ حقیقت کا سا کیا ہے اور اس کا بھی پورا اعتبار کیا ہے نہ کسی کی چیز غصب(۵) کرنا جائز۔ نہ بے اجازت استعمال کرنا جائز اور اگر حقیقت سے پوچھئے تو ہر چیز کا وہ حال ہوتا۔ جیسے مسجد کے لوٹے اور فرش جن کا کوئی مالک ہی نہیں نہ آپ نہ میں بلکہ ہر شخص کو ان کے استعمال کا حق ہے۔ گو یہ جائز نہ ہو کہ آپ اٹھا کر گھر میں رکھ لیں لیکن استعمال کا حق تو سب کو ہے۔ اسی طرح جو کپڑے آپ نے گٹھڑی میں باندھ کر گھر میں رکھے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا کہ چونکہ وہ بھی آپ کے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں۔ اور خدا کی چیز میں ہر شخص

(۱) تصدیق نہ ہونے کو اگر تکذیب نہ ہو تصدیق ہی شمار کیا گیا ہے (۲) اگر صرف حقیقت کو ثالث مقرر کیا جائے (۳) تو زندہ رہنا مشکل اور زندگی حرام ہوجائے (۴) ''حقیقت میں مالک ہر شے کے خدا ہیں یہ امانت چند دن کے لئے ہمارے پاس ہے'' (۵) زبردستی قبضہ کرنا۔

کا حق مساوی (۱) ہے سو آپ نے جو انہیں باندھ کر گھر میں رکھا ہے اگر حقیقت ہی حکمران ہوتی تو یہ آپ کا فعل کیسے جائز ہوتا اگر پھر بھی آپ ایسے ہی حقیقت پرست ہیں تو کوئی شخص آپ کی اچکن (۲) آپ کے بدن پر سے اتارنے لگے کہ اتنے دن تک آپ پہنے رہے اب میں پہنوں گا۔ تو آپ اُسے منع نہ کیجئے۔ واقعی اگر شریعت نہ ہوتی تو دنیا میں لوٹ اور غارت کا بازار گرم ہو جاتا اور امن وچین رخصت ہو جاتا۔

حقیقت پرست

مولانا رومی نے ایک ایسے ہی حقیت پرست جبری (۳) کی حکایت لکھی ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور جا کے درختوں کے پھل توڑ توڑ کے کھانا شروع کر دیئے۔ مالک کو خبر ہوئی اس نے منع کیا تو آپ کہتے ہیں کہ باغ بھی خدا کا اور درخت بھی خدا کا اور پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا۔ غرض آکل (۴) خدا کا اور ماکول بھی (۵) خدا کا، تو ہے کون منع کرنے والا اور تیرا اس میں ہے ہی کیا۔ مالک تھا حکیم (۶) اس نے نوکر سے ڈنڈا اور رسّا منگایا اور باندھ کے مارنا شروع کر دیا اب تو لگا غل مچانے (۷)۔ اس نے کہا کہ ڈنڈا بھی خدا کا اور رسّا بھی خدا کا تو بھی خدا کا میں بھی خدا کا غرض ضارب (۸) بھی خدا کا اور مضروب (۹) بھی خدا کا پھر تو کیوں غل مچاتا ہے (۱۰) پس پھر کیا تھا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار　　اختیارست اختیار ست اختیار (۱۱)

ہوش درست ہوگئے یہیں سے توحید وجودی خالی از شریعت کے اثر کا مسئلہ حل ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

---

(۱) برابر ہے (۲) شیروانی یا کوٹ وغیرہ (۳) جس کا عقیدہ تھا کہ انسان مجبور محض ہے (۴) کھانے والا (۵) جو چیز کھائی جا رہی ہے (۶) سمجھ دار (۷) شور مچانے لگا (۸) مارنے والا (۹) پٹنے والا (۱۰) تو کیوں شور مچاتا ہے (۱۱) ''میں نے جبر سے توبہ کی اختیار ہے اختیار ہے اختیار''۔

سر پنہان ست اندر زیروبم   فاش اگر گویم جہاں برہم زنم(۱)

اس کی تفسیر میں نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے یہ سنی ہے کہ سر پنہاں سے مراد توحید وجودی ہے مگر وہ نہیں جو ملحدین کی ہے بلکہ توحید وجودی حقیقی جو محققین کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ چونکہ افہام صحیح نہیں ہے (۲) اس لئے میں اُسے اگر صاف بیان کردوں تو اس کو غلط سمجھ کر لوگ عالم میں فساد مچادیں۔ یہ نہیں کہ توحید وجودی کا مسئلہ مضر (۳) ہے بلکہ افہام ٹھیک نہیں ہیں ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے اسلئے اندیشہ ہے کہ اس کے اظہار سے ایک طوفان بدتمیزی عالم میں مچ جائے جس کو ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے یہی معنی ہیں جہاں برہم زنم کے بطور اسناد الی السبب کے۔

شریعت کی رحمت

تو یہ شریعت کی رحمت ہے کہ اس نے ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ ملک حقیقی کا سا کیا ہے کہ مثلاً میراث کے ذریعہ سے جو چیز کسی کے پاس آوے وہ اس کی ملک ہے یا بیع کے یا ہبہ کے ذریعہ سے اس کے پاس آوے وہ بھی ملک ہے۔ رہے مباحات عامہ (۴) وہ کسی کی ملک نہیں مگر قبضہ کرنے کے بعد وہ بھی قابض (۵) کی ملک ہیں۔ مثلاً پانی یا خودرو گھاس یا جنگل کا جانور شکار اور مچھلیاں ان پر جو اول قبضہ کرے اسی کی ملک ہے۔ دیکھئے شریعت کی بدولت کس قدر انتظام درست ہے اگر یہ نہ ہو تو تمدن ہی درست نہ ہو۔ ایک غدر مچ (۶) جاوے اور ہر وقت وہ کیفیت رہے جیسے ڈاکہ پڑا کرتا ہے کہ آپ نے مجھ سے چھین لیا اور آپ سے

(۱) ''یعنی عشاق اپنے کلمات عشقیہ کو اجمالاً کہہ رہے ہیں میں اگر اس کے راز کو اور حقیقت کو ظاہر اور مفصل کہدوں تو عالم تباہ ہوجائے'' (۲) سمجھ درست نہیں (۳) نقصان دہ (۴) جیسے خودرو گھاس وغیرہ (۵) جس کے قبضہ میں ہو (۶) ہنگامہ برپا ہوجائے۔

اُس نے چھین لیا۔ غرض ہر وقت جنگ کا سامنا رہتا۔ اب بتلائیے حقیقت ہم پر زیادہ شفیق ہے یا شریعت مقدسہ۔ خوب سمجھ لیجئے حق تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ دنیا میں عقل پرست اور حقیقت پرست دونوں گروہ پیدا ہوں گے اور دونوں کے مقتضا پر عمل کرنے سے یہ تنگی ہوگی اس لئے شریعت کو نازل فرمایا جس نے ہر قسم کی تنگی کو دور کردیا۔ اسی احسان کا اعلام فرماتے ہیں: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ’’اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی‘‘ کتنے بڑے دعوے کے الفاظ ہیں۔ حضرت یہ دعویٰ آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ ہر طبیعت کے لوگ موجود ہیں اور ہر زمانہ میں ہوتے آئے ہیں۔ اگر اس دعوے میں کچھ بھی خامی ہوتی تو اس شدّ و مد سے تاکید کے ساتھ نہ فرماتے۔

بے دینوں کا اعتراض

شاید اس مقام پر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو دین میں تنگی کا کھلا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص شریعت پر عمل کرتا ہے اس کے ہر کام میں ڑوڑے اٹکتے ہیں ہم اپنے معاملات کے لئے چند مسئلے پوچھنے گئے تھے تو مولانا نے جو جواب دیئے کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں ناجائز تو ان میں زیادہ جواب یہی ملا تھا کہ ناجائز ہے۔

چنانچہ ہم قرض لیتے ہیں مگر سود کے بغیر نہیں ملتا اور بغیر قرض کے کام نہیں چلتا۔ اور شریعت سود کو حرام بتلاتی ہے۔ اب اس موقع پر عقل پرست تو یہ کہے گا کہ دین میں سخت حرج ہے بلکہ آجکل تو عقل پرستوں کا اجماع ہے کہ ساری خرابی شریعت ہی کی بدولت ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کا ایک قصہ یاد آیا، ایک صاحب میرے پاس روزانہ آتے تھے۔ وہ ایک روز ذرا دیر میں آئے میں نے تاخیر کا سبب پوچھا

کہا کہ ایک جلسہ کی شرکت کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ جس میں مسلمانوں کے اسباب تنزل پر غور کیا جارہا تھا۔ میں نے پوچھا آخر کیا طے ہوا، انہوں نے کہا اخیر یہ طے ہوا تھا کہ نعوذ باللہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب اسلام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جس نوکری کے فرائض بیان کر کے مسئلہ پوچھتے ہیں تو فتویٰ عدم جواز کا ملتا ہے۔ تجارت کے طریقوں کے متعلق پوچھنے پر کسی کو قمار(۱) بتایا جاتا ہے، کسی کو ربا۔ جب ہر قدم پر لَا یُجَوَّزُ (جائز نہیں ہے) کا فتویٰ ہے تو اب بجز اس کے کہ بیکار بیٹھ رہیں اور کیا کریں۔

شبہ کا جواب

اب شبہ یہ ہے کہ جب ہر ہر قدم پر تنگی اور حرج ہے تو پھر قرآن میں حرج کی نفی کیسے کی گئی اب اس شبہ کا جواب سنئے کہ خدا تعالیٰ کو اس زمانہ کا بھی علم تھا اور باوجود اس کے پھر جو فرماتے ہیں: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) سو کوئی تو بات ہے جس پر اتنا بڑا دعویٰ کیا گیا ہے، ورنہ نزول قرآن کے زمانہ سے آج تک کسی نے اس نفی پر کیوں نہ اعتراض کیا حالانکہ ہر زمانہ میں مخالفین بکثرت رہے ہیں۔ پھر نفی بھی معمولی نہیں۔ نکرہ ہے تحت میں نفی کے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذراسی اور چھوٹی سے چھوٹی تنگی بھی نہیں ہے۔ سو اُس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو جو یہ پہاڑ کے برابر تنگی نظر آرہی ہے یہ تنگی واقع میں آپ میں ہے شریعت میں نہیں، جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد　　ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد(۲)

حقیقت میں تنگی اُدھر سے ہے۔ اِدھر سے نہیں ہے۔ معترض نے تنگی کا محل

(۱) کسی میں جوئے کا حکم لگایا جاتا ہے کسی میں سود کا (۲) ''اے احمق اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا''۔

نہیں دیکھا۔ اپنی تنگی کو شریعت کی تنگی سمجھ گیا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہماری بستی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک عورت بچہ کو پاخانہ پھرارہی تھی۔ چاند دیکھنے کا وقت تھا۔ سب چاند دیکھنے لگے، وہ بھی چیتھڑے(۱) سے پاخانہ صاف کر کے چاند دیکھنے کھڑی ہوئی۔ اتفاق سے کچھ پاخانہ اس کی انگلی میں لگا رہ گیا تھا۔ عورتوں کی عادت کے موافق ناک میں انگلی رکھی تو انگلی میں سے بو آئی۔ کہنے لگی اے ہے آج سڑا(۲) ہوا چاند کیوں نکلا۔ اب تمام عقلاء سمجھتے ہیں کہ چاند سڑا ہوا نہ تھا اس کی انگلی سڑی ہوئی تھی اور یہ اس کی حماقت تھی جو اسے اپنی انگلی کی گندگی کی خبر نہ ہوئی اور چاند کو سڑا ہوا کہنے لگی اسی طرح تنگی ہمارے اندر ہے شریعت میں نہیں ہے۔

دین میں فرضی تنگی کی دوسری مثال

اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طبیب حاذق کے پاس ایک مریض گیا کسی کوردہ(۳) کا رہنے والا۔ جہاں نہ دوا ملتی ہے نہ پرہیزی غذا ملتی ہے تخم کاسنی اسطوخودوس(۴) بھی دستیاب نہیں ہوتا اب حکیم صاحب نے اُسے نسخہ لکھدیا۔ اس نے کہا حکیم صاحب کیا کھائیں۔ حکیم ''بکری کا گوشت'' مریض یہ تو ہمارے یہاں نہیں ملتا۔ حکیم۔ اچھا ترئی کا سالن' مریض۔ یہ بھی نہیں ملتا حکیم اچھا کدو پالک کا ساگ۔ مریض یہ اجی یہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ حکیم آخر پھر کیا ملتا ہے۔ مریض۔ کریلے ملتے ہیں۔ حکیم دیکھو کریلے نہ کھانا مریض بینگن ملتے ہیں۔ حکیم بینگن بھی نہ کھانا۔ اس نے کہا ارے صاحب اس کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اب یہ مریض صاحب بہت تنگ دل ہوکے اور ناک منہ چڑھا کے آئے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ طب یونانی بہت تنگ ہے۔ حکیم صاحب سے جو کچھ بھی پوچھو اس کے کھانے کو منع کرتے ہیں۔ اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کا مطب تنگ ہے یا اس دیہاتی کا گاؤں تنگ ہے۔

(۱) کپڑے کے ٹکڑے (۲) بدبودار (۳) گاؤں کا (۴) دواؤں کے نام۔

شریعت میں وسعت کی مثال

اب سمجھئے کہ شریعت کی تنگی تو جب ثابت ہوتی کہ سب لوگ مل کر شریعت پر عمل کرتے پھر بھی نہ ہوسکتا بتلائیے یہ تنگی ہے کہ وسعت ہے۔ یقیناً اس کو کوئی تنگی نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً بیع ہے(۱) کہ بعت واشتریت (۲) سے ہوجاتی ہے۔ بلکہ اس کے کہے بغیر بھی ہوجاتی ہے جسے بیع تعاطی کہتے ہیں۔ تنگی تو جب ہوتی کہ ایسا ہوتا کہ جب تک ایک ہزار مرتبہ بائع بعت اور مشتری اشتریت (۳) نہ کہے اس وقت تک بیع نہ ہوگی۔ ریل پر بیٹھے ہیں سودالیا ہے اس وظیفہ کے پورا ہونے تک ریل ٹھہرتی نہیں۔ تب واقعی مشکل ہوتی۔ اب کیا مشکل ہے۔

اور جس جگہ آپ کو اشکال نظر آتا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ آپ تنہا شریعت کے موافق معاملہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا شخص اس کی پروا نہیں کرتا۔ تو اس طرح تو ہر قانون تنگ ہوجائے گا۔ آپ کوئی قانون شریعت کا ایسا بتلا دیجئے کہ سب مل کر اس پر عمل کرنا چاہیں اور نہ ہوسکے۔ اس لئے نہایت قوت کے ساتھ فرماتے ہیں: مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ''اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی'' بہرحال اتنا بڑا دعویٰ عقل پرستی کے زمانہ میں اگر واقعی دین میں سہولت نہ ہوتی۔ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ بحمداللہ شبہ کا جواب ہوگیا۔

عقل کے استعمال کی حدود

اس سے پہلے یہ بیان ہورہا تھا کہ شریعت کی سہولت ورعایت اس قدر ہے کہ عدم اعتقاد ضد کو قائم مقام کردیا، اعتقاد توحید کا یہ تو شریعت کی شفقت ہے۔

(۱) خرید وفروخت (۲) میں نے بیچا اور میں نے خریدا (۳) ایک ہزار مرتبہ بیچنے والا میں نے بیچا کہے اور خریدنے والا میں نے خریدا کہے۔

اور عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ ہم اعتقاد توحید کا دواماً استحضار(۱) رکھیں۔ تو زیادہ خیر خواہ کون ہوا عقل کے شریعت ان ہی آثار کو دیکھ کر تو مولانا فرماتے ہیں ؂

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را(۲)

اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل کو پھینک ہی دیں کہ محض بیکار ہے۔ نہیں وہ بہت کارآمد ہے مگر ایک حد کے اندر اندر۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص پہاڑ پر چڑھنا چاہتا ہے اور اس پر اتنی چھوٹی اور ایسی اونچی سیڑھیاں ہیں کہ ان پر گھوڑا نہیں چڑھ سکتا ہاں دامن کوہ(۳) تک پہنچا سکتا ہے تو کیا پہاڑ پر کارآمد نہ ہونے سے گھوڑا بالکل بیکار ہوگیا۔ ہرگز نہیں کیونکہ دامن کوہ تک بھی بہت مسافت ہے جس میں گھوڑے سے مدد ملتی ہے بس یہی حال عقل کا ہے کہ توحید و رسالت اور اصول اسلام کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہے۔ اصول کو تو عقل سے سمجھ لیجئے، اس کے بعد اس کو بالکل چھوڑ دیجئے۔ ورنہ گھوڑے کی طرح گرے گی اور خوامخواہ آپ کی بھی ہڈیاں پسلیاں توڑے گی۔ جب خدا کا خدا ہونا۔ اور رسول اللہ ﷺ کا برحق اور مطاع ہونا عقل سے ثابت ہوگیا۔ بس اب اسے چھوڑ دیجئے۔ اور آگے عشق و محبت سے کام لیجئے اور اس طرح سے اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے ؂

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو(۴)

یعنی جب توحید و رسالت کو سمجھ لیا تو اس کے بعد اب ضرورت اس کی ہے کہ جو ارشاد ہو آمنا وصدقنا (۵)

---

(۱) ہر وقت توحید پیش نظر رہے (۲) ''عقل دور اندیش کو بارہا آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا'' (۳) پہاڑ کے آغاز تک (۴) ''زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر فدا ہیں۔ جان آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہیں'' (۵) ہم نے اس کو مانا اور اس کی تصدیق کی۔

احکام دینیات پر عقلاء کے اعتراضات کی حیثیت

نہ یہ کہ خواہ مخواہ اس میں شبہات پیدا کریں کہ صاحب پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے، عذاب قبر عقل کے خلاف ہے۔ جب مُردہ میں جان ہی نہیں ہے تو عذاب کس پر۔ اور اگر کہو جسم پر عذاب ہے تو ہم جسم کو بھی فنا کردیں گے اور ہم نہ کریں تو چار دِن میں وہ خود ہی فنا ہوجائے گا۔ پھر عذاب کسے ہوگا جیسے کسی افیونی کی ناک پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی اور وہ بار بار اڑا دیتا تھا، آخر کار جھنجلا کے ناک ہی کاٹ ڈالی کہ لے اب اڈا ہی نہیں رہا۔ اب کہاں بیٹھے گی۔

اسی طرح جب وہاں قبر میں مردہ ہی گل سڑ کے ختم ہوگیا تو اب عذاب کس پر ہوگا۔ صاحبو ہمارے پاس جواب ہر شبہ کا ہے۔ بحمداللہ علماء جواب سے قاصر نہیں ہیں مگر یہ غور کرو کہ آیا ان شبہات کا جواب دینا علماء کا فرض منصبی ہے بھی یا نہیں۔ اس کو بھی ایک مثال سے سمجھئے۔

آپ کا ایک مقدمہ ہے کسی جج کے اجلاس پر اس نے آپ کا مقدمہ ہرادیا۔ اور دفعہ کا حوالہ بھی دے دیا۔ اب آپ جج کے پاس جاویں کہ صاحب فیصلہ تو قانون کے موافق ہے، مگر خود قانون میں سقم عقلی ہے(۱) اس لئے مجھے اس میں کلام ہے۔ تو جج کیا کرے گا وہ کہے گا کہ ہم اور کچھ نہیں جانتے بس جو قانون ہے ہم اسی کے پابند ہیں، اور تمام عقلاء جج کے اس جواب کو معقول اور صحیح کہیں گے اور اس دفعہ پر جو اس شخص کے اعتراضات ہیں ان کا جواب دینا جج کے ذمہ نہ سمجھیں گے۔ تو تعجب کی بات ہے کہ جج کا یہ کہنا تو کافی سمجھا جائے گا اور علماء کا یہ کہنا کہ حکمِ الٰہی یہی ہے کافی نہ سمجھا جاوے کیونکہ جس طرح حاکم عالم بالقانون(۲)

(۱) قانون میں عقلی کوتاہی ہے (۲) قانون جاننے والا ہے، بنانے والا نہیں۔

ہے واضع قانون نہیں ہے اسی طرح علماء بھی عالم بالقانون ہیں واضع قانون نہیں ہیں ان کے ذمہ قانون کا بتلا دینا ہے۔ لِـم (۱) اور وجہ کا بتلانا نہیں ہے۔ گو وہ احکام کی لمیات (۲) کو بکثرت جانتے ہیں۔ لیکن جاننے کے بعد بتلا دینا اُن پر ضروری نہیں۔ بلکہ سوال عن العلل (علتوں سے سوال) کے جواب میں ان کا یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ زنداں خبرے نیست کہ نیست (۳)

پس علماء پر ضرور نہیں ہے اسرار کا ظاہر کرنا بلکہ صوفیہ کرام جو زیادہ غیور ہیں وہ تو اظہار کی ممانعت کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں ؎

با مدعی نہ گوئید اسرار عشق و مستی بگذارتا بمیرد در رنج خود پرستی (۴)

دیکھئے صوفیہ تو اظہار اسرار سے بالکل منع ہی کرتے ہیں اور علماء بچارے تو کبھی کبھی بتا بھی دیتے ہیں مگر حیرت ہے کہ صوفیہ پر کچھ اعتراض نہیں کیا جاتا جو کچھ کمبختی ہے علماء ہی کی ہے کہ ان کی تو نماز بھی ناجائز اور صوفیہ کی گالیاں بھی جائز۔ بس جی اب تو علماء بھی صوفیہ بنیں تو کچھ کام چلے۔ مگر خدا کے لئے دوکان دار صوفی نہ بنیں بلکہ سچ مچ کے صوفی بنیں۔ تو جب علماء کا یہ اظہار علل فرض منصبی نہیں (۵) تو وہ کیوں ظاہر کریں بلکہ صرف ضابطہ کا جواب دے کر بات کو ختم کر دیں۔

حکیمانہ جواب

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے درس میں ایک طالب علم ہے غبی۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت ایام حیض کے روزہ کی تو قضا ہے اور نماز کی

(۱) یہ قانون مقرر ہونے کی وجہ کیا ہے (۲) وجوہات (۳) ''افشاء کرنا راز کا مصلحت نہیں ورنہ علماء کی مجلس کوئی خبر ایسی نہیں کہ ان کو خبر نہ ہو'' (۴) ''مدعی اسرار عشق و مستی مت بیان کر اس کو تکبر و خود پرستی میں مرنے دو'' (۵) علتوں کا بیان کرنا ان کی ذمہ داری نہیں۔

قضا نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف کرو گے تو اتنی جوتیاں لگیں گی کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔ مولانا حکیم تھے۔ اسی باب میں ان کا ایک شعر ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٌ عَلی الْقَمَمِ (۱)

تو ضرورت ضابطہ کے جواب کی بھی ہے تاکہ لوگوں کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوتا رہے بہرحال ایمان لانے کے بعد ضرورت نہیں لم وکیف کی۔ بلکہ وہ مسلک رکھنا چاہئے جیسا عرف گنجوری فرماتے ہیں ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کارِ تو (۲)

عاشق کا حال

غور سے سننے کی بات ہے کہ اگر کسی کو تعشق ہو جاوے کسی مردار کے ساتھ یا کسی مرد کے ساتھ یعنی امرد (۳) کے ساتھ کہ جس میں افعل التفضیل کا ہمزہ بھی لگا ہوا ہے۔ یا کسی بازاری عورت کے ساتھ اور وہ کہتی ہو کہ میں اس وقت ملوں گی کہ تم پہلے کرتہ ٹوپی اتار کے سات دفعہ بازار کے بیچ سے ننگے طواف کرتے ہوئے نکل جاؤ۔ اگر یہ واقعی محبّ ہے تو کبھی یہ نہیں پوچھے گا کہ مجھے اس طرح رسوا کرانے میں تیرا کیا نفع۔ بلکہ کہے گا کہ بہت اچھا اور پاجامہ بھی اتارنے کو تیار ہو جائے گا اور اگر کوئی ملامت بھی کرے گا تو اسے یہ جواب دے گا ؎

نہ سازد عشق را گنجِ سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت (۴)

اسی طرح وہ اگر پچاس چپت بھی لگا دے تو برا نہ مانے گا۔ بلکہ اگر قتل بھی

(۱) نصیحت اگر علم وحکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سے سب سے بلیغ نصیحت گر ہے" (۲) "آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے" (۳) نابالغ لڑکا (۴) "عشق کا گوشہ سلامتی کے موافق نہیں اس کے مناسب کوچۂ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے"۔

کرے تو راضی رہے گا اور یہ کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من (۱)

تنویر میں ابن عطاء نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی شخص کسی پر عاشق ہوا تھا اتفاق سے وہ پکڑا گیا اور اس کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ جب کوڑے مارے جارہے تھے تو وہ بالکل خاموش تھا یہاں تک کہ ننانوے کوڑے لگ چکے، جب سواں کوڑا مارا گیا تو آہ کی۔ کسی نے پوچھا یہ کیا کہ ننانوے کا تو تحمل (۲) کرلیا اور ایک کا تحمل نہ کرسکا۔ کہا ننانوے تک محبوب دیکھ رہا تھا، اور جب سواں لگا تو وہ چلا گیا تھا ؎

بجرم عشق تو ام میکشند وغوغائیست تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست (۳)

محبوب کے سامنے تکلیف میں بھی مزہ ہے۔ یہی وہ مراقبہ ہے جس کی تعلیم حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کو دی ہے۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (۴) یعنی آپ صبر کیجئے (مخالفین کی باتوں پر اور یہ صبر اس لئے آسان ہوسکتا ہے کہ) آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں جو کچھ ہورہا ہے ہمارے دیکھتے ہوئے ہورہا ہے۔ تو کشتن کی تکلیف تو ہے مگر تو نیز برسرم بام آ (۵) کی راحت بھی ہے جس سے یہ کلفت سہل ہوجاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ معشوق کے امرونہی (۶) بھی ناگوار نہیں ہوتی اس کی مارکوٹ بھی ناگوار نہیں ہوتی، یہ جو احکام تشریعیہ ہیں (۷) یہ تو محبوب کے اوامرونواہی ہیں اور احکام تکوینیہ محبوب کی مارکوٹ ہے کہ آج بیمار ہیں۔ آج زخم ہے آج دنبل ہے۔ اور جو اُن کا واقعی عاشق ہے اس کا ان دونوں میں یہ مسلک ہے

(۱) ''تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے'' (۲) ننانوے تو برداشت کئے اور ایک برداشت نہیں ہوا (۳) ''تیری محبت کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور اسی کا شوروغل ہے تو یہیں بام پر آجا اچھا تماشائی تو ہی ہے'' (۴) الطّور: ۴۸ (۵) تو بھی بام پر آ (۶) معشوق کا کسی کام کرنے یا نہ کرنے کا حکم دینا بھی برا نہیں لگتا (۷) شرعی احکام تو محبوب (یعنی اللہ) کے احکام اور ممنوعات ہیں۔

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایان از باد شاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور(۱)
دمادم شرابِ الم در کشند وگر تلخ بینند دم در کشند(۲)

بنسبت عقل کے شریعت زیادہ شفیق ہے

تو بس بعد تحقیق اصول کے کہ وہ عقلی ہیں ایسی چیز کی ضرورت ہے جو آگے پہاڑ پر چڑھانے والی ہو۔ تو معلوم ہو گیا کہ عقل کی عملداری کہاں تک ہے اور عشق کی کہاں سے اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں ہوائی جہاز کی ضرورت ہے وہاں گھوڑے کو لے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ گھوڑے کو ماریں گے اور اپنی بھی ہڈی توڑیں گے اسی لئے تو کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را(۳)

اب تو آپ کو عقل کی حد معلوم ہو گئی کہ یہ بیکار تو نہیں ہے مگر ایک خاص حد تک کارآمد ہو سکتی ہے اس سے آگے نہیں۔ اب یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عقل شریعت سے زیادہ شفیق نہیں ہے جیسا کہ اوپر اس کی دلیل بھی مذکور ہوئی ہے اور پھر مع شیئ زائد ذکر کرتا ہوں کہ عقل کا مقتضاء تو یہ تھا کہ کسی وقت بھی ذکر و توجہ سے غافل نہ ہو مگر شریعت مقدسہ نے عدم توجہ کی بھی اجازت دیدی ہے۔ پھر اجازت بھی مطلق نہیں بلکہ اس کا بھی بڑا درجہ۔ کیونکہ اجازت کے دو مرتبے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ حالت بے توجہی معصیت نہیں گو ناقص ہے۔ سو شریعت

---

(۱) ''اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں تو اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں'' (۲) ''ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں'' (۳) ''عقل دور اندیش کو بارہا آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا''۔

نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس پر رنج کرنے سے بھی ممانعت فرمادی ہے۔ حالانکہ یہ شخص اکمل کے مقابلہ میں ناقص ہے مگر خود اسے ناقص سمجھنے کی بھی اجازت نہیں ہے یہ اجازت کا دوسرا مرتبہ ہے کہ معصیت کی نفی کر کے اپنے کو ناقص سمجھنے سے بھی منع کر دیا۔

صحابہ کا حال

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت حنظلہؓ کی ملاقات ہوئی حضرت صدیق اکبرؓ سے، انہوں نے پوچھا اے حنظلہ کیسے ہو، جواب دیا نَافَقَ حَنْظَلَةُ نافق حنفظلة (یعنی میں) تو منافق ہوگیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پوچھا یہ کیسے۔ فرمایا کہ جب ہم حاضر ہوتے ہیں دربار میں رسول اللہ ﷺ کے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا جنت ودوزخ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب وہاں سے آتے ہیں بال بچوں میں مشغول ہوکر سب بھول جاتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر یہ نفاق ہے تو پھر میں بھی منافق ہوں۔ کیونکہ میں بھی اس میں مبتلا ہوں۔ آؤ چلو رسول اللہ ﷺ سے اس کا علاج پوچھیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور سب حال بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا یاد رکھو: لَوْ كُنْتُمْ كَمَا تَكُوْنُوْنَ عِنْدِی۔ لَصَافَحَتُكُمُ الْمَلٰئِكَةُ وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً۔ (۱)

اس حدیث کے سمجھنے میں علماء قشر (۲) پریشان ہوگئے اول تو ان کو نَافَقَ حَنْظَلَةَ (حنظلہ منافق ہوگیا) پر اشکال ہوا کہ محض تفاوت (۳) حالت کو انہوں نے نفاق کیسے کہدیا۔ پھر حضور ﷺ کے جواب پر انہیں شبہ ہوا کہ اس جواب سے حضرت حنظلہ کا اشکال کیونکر حل ہوا۔ اس جواب کی شرح صوفیہ سمجھے اس پر تو

(۱) ''یعنی اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ تمہاری ہر وقت وہی حالت رہتی جو میرے سامنے ہوتی ہے تو تم سے ملائکہ مصافحہ کیا کرتے مگر اے حنظلہ ایک ساعت کیسی اور ایک ساعت کیسی'' (۲) علمائے ظاہرین (۳) حالات کے فرق کو۔

سب کا اتفاق ہے کہ مقصود تو حضور ﷺ کا حضرت حنظلہ کی تسلی کرنا ہے۔ مگر سوال یہ ہے اس جواب سے تسلی کیسے ہوگئی۔ اول تو یہ سمجھئے کہ یہاں نفاق سے حقیقی نفاق (۱) مراد نہیں، کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وحضرت حنظلہ ضرور یہ بات جانتے تھے کہ نفاق نام ہے ابطان الکفر واظہار الایمان (۲) کا۔ اور جب ہم جانتے ہیں تو کیا وہ نہیں جانتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں ابطان الکفر نہ تھا (۳)۔ مگر مجازاً اس کو نفاق کہہ دیا اور اس کا منشاء یہ تھا (۴) کہ حالت حضور (۵) میں ایمان کامل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت عالم غیب رائے العین (۶) ہوتا ہے تو تصدیق بھی کامل ہوتی ہے اور حالت غیبت میں تصدیق کی یہ شان نہیں ہوتی صرف عقلی تصدیق ہوتی ہے جو علم کا درجہ ہے معائنہ ومشاہدہ کی سی کیفیت نہیں ہوتی۔ اس تفاوت کی وجہ سے وہ یہ سمجھے کہ ہمارا ایمان حضور ﷺ کے سامنے اور طرح کا ہوتا ہے، پیچھے اور طرح کا ہوتا ہے گویا کبھی کامل ہے کبھی ناقص ہے اور مطلوب ایمان کامل ہے تو جب اس میں نقص ہوگا وہ نفاق کے مشابہ ہوگا گو حقیقی نفاق نہ ہو۔ یہ تو نَافَقَ حَنْظَلَةُ کی تفسیر ہوئی۔

سوال وجواب

اب سوال یہ ہے کہ حضرت حنظلہ نے اپنی حالت ادنیٰ درجہ کی سمجھ کر اس پر تاسف (۷) کا اظہار کیا تھا تو جواب میں کوئی تسلی کا مضمون ہونا چاہیئے، اور جو جواب حدیث میں مذکور ہے بظاہر وہ تسلی کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ ساعۃً ساعۃً ہی پر تو انہیں تاسف ہے۔ پھر یہ جواب وجہ تسلی کیونکر ہوسکتا ہے۔

میرے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی حقیقت بیان فرمائی

(۱) وہ نفاق مراد نہیں جو منافقین میں تھا (۲) نفاق نام ہے کفر کو باطن میں چھپانے اور اسلام کو ظاہر کرنے کا (۳) کفر پوشیدہ نہ تھا (۴) اس کی وجہ یہ تھی (۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں (۶) نظروں کے سامنے (۷) افسوس کا اظہار۔

تھی کہ حکمت حق اس کو مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے(۱) اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضور ﷺ کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا۔ بلکہ ملکوت (۲) میں پہنچا دیا جاتا۔ اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے، اجمالاً اتنا بتائے دیتا ہوں کہ باہم دو شخصوں میں مصافحہ جب ہوتا ہے عادتاً ایک عالم میں ہوتا(۳) ہے اور جس عالم میں ہم ہیں یہ محسوس ہے(۴) اگر یہ مصافحہ یہاں ہو تو ملائکہ جب تک محسوس نہ ہوں گے عادتاً مصافحہ نہ ہوگا اگر کوئی کہے کہ محسوس ہونے کی کیا ضرورت ہے یوں ہی مصافحہ کرتے تو سمجھو محسوس کے معنی مرئی یا مبصر (۵) کے نہیں ہیں لمس بھی (۶) تو حواس میں سے ہے تو مصافحہ کم از کم بغیر لمس کے نہیں (۷) ہوتا جو لوگ آنکھ سے معذور ہیں وہ بھی حواس کے حصہ دار ہیں گو لامسہ ہی سہی۔ بہرحال اس عالم میں مصافحہ ہونا عادتاً موقوف اس پر ہے کہ ملائکہ محسوس ہوں اور عادتاً ملائکہ صرف ملکوت (۸) میں محسوس ہوتے ہیں، ناسوت (۹) میں محسوس نہیں ہوتے تو وہ مصافحہ اس طرح ہوتا کہ ہم ملکوت میں منتقل کردیئے جاتے ۔تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایک ہی حالت پر قائم رہتے تو تم ملکوت میں منتقل کردیئے جاتے اور ایسا ہوتا تو تمہارے ناسوت میں رہنے کی جو حکمت تھی اس کا ابطال (۱۰) لازم آتا تو اس غیبت پر تاسف وقلق کرنا گویا اس ابطال حکمت کی تمنا(۱۱) کرنا ہے جو کہ غیر محمود (۱۲) ہے تو

---

(۱) انسان کو اس عالم میں جہاں فرشتے رہتے ہیں یعنی (آخرت) وہاں سے نکال کر دنیا میں آباد کیا جائے (۲) اس عالم دنیا میں نہ رہتا بلکہ فرشتوں کے عالم میں پہنچ جاتا (۳) دو انسانوں میں مصافحہ جب ہوگا جب دونوں ایک عالم میں ہو (۴) جس عالم میں ہم ہیں یہاں احساس پایا جاتا ہے (۵) محسوس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ چیز صرف نظر ہی آئے (۶) قوت لامسہ (چھوکر محسوس کرنے کی طاقت) بھی تو حواس خمسہ میں سے ایک ہے (۷) بغیر چھوئے مصافحہ نہیں ہوتا (۸) عالم آخرت (۹) عالم دنیا (۱۰) جس حکمت کی بنا پر دنیا میں بھیجا گیا ہے وہ باطل ہو جاتی ہے (۱۱) اس حالت کے ختم ہونے پر افسوس کرنا گویا اس حکمت کے باطل کرنے کی خواہش ہے (۱۲) جو پسندیدہ نہیں۔

اس ذہول وغیبت کی (۱) اجازت کا بڑا درجہ اس سے ثابت ہوگیا۔

غیبوبیت وحضور کا فائدہ

تو کتنی بڑی رحمت ہے شریعت کی بمقابلہ عقل کے اور صوفیہ نے اس حکمت کو اس تقریر سے بھی زیادہ واضح وسہل عنوان سے ظاہر کردیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم ۔۔۔ گرنیست غیبتے نہ دہدلذتے حضور (۲)

یعنی جس طرح بدوں پیاس کے پانی کی قدر نہیں اسی طرح غیبت ہی کی بدولت حضور کی لذت ہے گو حضور کی حالت فی نفسہ افضل واکمل ہے مگر حضور کی روح ولذت خود غیبت پر موقوف ہے اس لئے اس عارض پر نظر کر کے حالت اکمل واعلیٰ یہی ہے کہ کبھی غیبت ہو کبھی حضور ہو (۳)

لذت ذکر

اسی واسطے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک خادم کو جواب دیا تھا۔ جنہوں نے یہ عرض کیا تھا کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسے پہلے آیا کرتا تھا، آپ نے فرمایا میاں تم کو خبر نہیں، پورانی جورواماں ہوجاتی ہے۔ میں کہتا ہوں پرانی سے مراد بڑھیا نہیں بلکہ جوان بھی رہے تب بھی ویسا شوق ذوق باقی نہیں رہتا اور اگر کچھ دنوں کے لئے جدائی ہوجاوے مثلاً کہیں سفر سے آویں تو اس وقت پھر ایک خاص کیفیت شوق کی عود کر آتی ہے۔ (۴)

سو یہ حکمت ہے اس انقطاع توجہ میں کہ غیبت ہی پر حضور کی لذت

---

(۱) تو اس کیفیت کے ختم ہونے کی ایک بڑی وجہ سمجھ میں آگئی (۲) محبوب کی جدائی کی شکایت نہیں اگر جدائی نہ ہوتی تو وصل میں لطف ولذت نہ ہوتی'' (۳) اعلیٰ وافضل یہ حالت ہے کہ کبھی عالم آخرت بالکل مشاہد ہو اور کبھی نہ ہوتا کہ مشاہدہ کا پورا لطف حاصل ہوسکے (۴) لوٹ آتی ہے۔

موقوف ہے (۱) اس کے علاوہ دوسری حکمت یہ ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ باوجود عدم تقاضا (۲) کے حق کی عبادت کرتا رہے۔ تیسرے یہ کہ حضور کے وقت معاصی (۳) کا تقاضا بھی نہیں ہوتا اس لئے اگر اس وقت معاصی سے بچے تو کیا کمال ہے وہ تو فرشتے بھی کرتے ہیں، انسان کا کمال یہی ہے کہ تقاضائے معصیت کے ساتھ معصیت (۴) سے بچے پس اگر حضور دائمی (۵) ہوتا تو انسان گویا فرشتہ ہوجاتا انسان نہ رہتا۔ اور جب آپ آپ نہ رہے تو آپ کا کمال ہی کیا ہوا۔

غرض یہ کہ اگر یہ حالت غیبت نہ ہوتی تو آپ بھی فرشتہ بن جاتے حکمت مقتضی تھی انسان کو بسانے کی اس لئے اس حکمت حق کا تقاضا دوسرے انسانوں کے بنانے کا ہوتا جو انسان بن کر کام کرتے تو آپ ہی کیوں نہ انسان رہیں اور خدا کو خبر ہے کہ اس میں کیا کیا حکمتیں ہوں گی یہ تو وہ ہیں جو ہم جیسے ضعفاء (۶) بھی سمجھ لیتے ہیں ورنہ حکمتیں تو غیر متناہی ہیں ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (۷)

سو حق تعالیٰ کے کلمات واسرار وحکم کا کون احاطہ کرسکتا ہے۔ اگر تمام دنیا کے موجودات کاتب ہوں اور تمام روئے زمین کے سمندر روشنائی بن جائیں تو سب ختم ہوجائیں مگر وہ ختم نہ ہوں۔ مگر اہل اللہ کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں اس میں سے کچھ ہم لوگوں کی قناعت کے لئے بیان بھی کردیتے ہیں۔ اب سمجھ میں آگیا کہ حضور ﷺ کا جواب کیسا تسلی بخش جواب ہے کہ یہی حالت قرین حکمت ہے کہ کبھی

(۱) اس توجہ کے منقطع ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ اس غیبوبیت ہی پر حضور کی لذت موقوف ہے (۲) عبادت کا تقاضہ نہ ہونے کے باوجود عبادت کرے یہ انسان کا کمال ہے (۳) گناہوں کا (۴) گناہ کے تقاضے کے باوجود گناہ سے بچے (۵) اگر ہر وقت وہ کیفیت حضور رہتی تو آدمی فرشتہ بن جاتا (۶) کمزور (۷) ”آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجائے اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر مدد کیلئے ہم لے آویں“ الکہف: ۱۵۹۔

کچھ ہو کبھی کچھ ہو۔

فراق وصل کی حقیقت

اسی واسطے جو عارف ہیں وہ ایسے ذہول کو مضر(۱) نہیں سمجھتے مگر ان کا ذہول ہمارا سا ذہول نہیں کہ ہمیں بالکل کچھ پتہ ہی نہیں رہتا۔ اُن کا ذہول بس اتنا ہوتا ہے کہ استحضار کا غلبہ(۲) نہیں رہتا۔ جیسے عاشق کو معشوق کا ذہول کلی تو کبھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی کبھی بے کلی ہوتی ہے(۳) اور کبھی کچھ سکون بھی ہو جاتا ہے بس وہی عارف کا ذہول ہے اور اسی کو وہ فراق کہتے ہیں۔ ان میں جو محقق نہیں ہیں وہ اس حالت پر متاسف ہوتے ہیں اور محقق کو گو طبعاً قلق(۴) ہوتا ہے مگر وہ اُسے عقلاً دفع کرتا ہے۔ چنانچہ اسی غلبہ استحضار کا نام اصطلاح میں وصل اور ذہول کا نام فراق ہونے کی بناء پر عارف محقق کہنے لگتا ہے ؎

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب — کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے (۵)

یہ فراق حقیقی نہیں بلکہ فراق صوری مراد ہے۔ یعنی جب غلبہ استحضار کا نہ ہو بس وہ ان کی اصطلاح میں فراق ہے۔ اور جس فراق کی علی الاطلاق حافظ نے مذمت کی ہے وہ اصطلاحی فراق نہیں ہے بلکہ وہ لغوی فراق ہے یعنی ذہول محض چنانچہ کہتے ہیں ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت — فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر — کنایتے است کہ از روزگار ہجراں گفت (۶)

---

(۱) ایسی بے التفاتی نقصان دہ نہیں (۲) ان کی غفلت صرف اتنی سی ہوتی ہے کہ ان کو بعض اوقات مشاہدہ کا غلبہ نہیں ہوتا (۳) عاشق معشوق کو بالکل تو کبھی بھی نہیں بھولتا کبھی اس کو بے چینی اور کبھی سکون ہوتا ہے (۴) افسوس (۵) کیسا وصال اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہیئے اسے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا'' (۶) ''میں نے پیر مرشد سے ایک اچھی بات سنی کہ فراق یار (یعنی عدم معرفت) وہ حالت پیدا کرتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ واعظ شہر روز قیامت کے ہول وخوف بیان کر کے ڈراتا ہے وہ میرے روزگار ہجر پر آفت کا ایک اشارہ ہے''۔

تو دونوں قولوں میں اب تعارض نہیں رہا ابتدائے عشق میں یہی اصطلاحی فراق قلق(۱) میں ڈالتا ہے اور انتہائے عشق میں رضاء کا غلبہ تسلی دیتا ہے(۲)۔

مقصود رضاء درست ہے

تفصیل یہ ہے عشق کے مقتضیات میں سے یہ بھی ہے کہ جو محبوب پسند کرے اسے یہ بھی پسند کرے مثلاً محبوب نے دو روپے دیئے کہ آم خرید لاؤ۔ تو جو محقق تھا وہ تو چلا گیا اور جو ہوسناک تھا وہ وہیں مچل گیا کہ ہائے میں دولت دیدار کو چھوڑ کر بازار کیسے جاؤں یہ تو بُعد ہے وصل کے بعد فراق کو کیسے گوارا کروں اور محقق اس وقت یوں کہتا ہے ۔

أُرِيْدُ وِصَالَهُ وَيُرِيْدُ هِجْرِیْ فَاتْرُكُ مَا أُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

یعنی میں پاس رہنا چاہتا ہوں اور محبوب دور رکھنا چاہتا ہے میں اپنی مراد کو اس کی مراد پر فدا کرتا ہوں اور جو اس کی تجویز ہے وہی مناسب ہے اسی کا ترجمہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے ۔

میل من سوئے وصال و میل او سوے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست (۳)

تو محقق عاشق اس فراق ہی کو ترجیح دے گا گو اس میں بے کلی ہی ہوا کرے کیونکہ محبوب تو خوش ہے۔

حدیث کی تشریح

اور محققین نے اسی اصل پر جناب رسول مقبول ﷺ کے اس ارشاد کی تفسیر کی ہے

(۱) اصطلاح میں جس کو فراق کہتے ہیں اس سے رنج ہوتا ہے (۲) انتہائے عشق میں رضا سے تسلی حاصل ہوتی ہے (۳) ''میری خواہش وصال کی ہے اور محبوب ہجر کا خواہشمند ہے میں نے اپنی خواہش کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی خواہش پوری ہو جائے''۔

کہ اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً یعنی حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے قلب پر بھی ایک پردہ سا پڑتا ہے جس کے لئے میں استغفار کرتا ہوں دن میں سو مرتبہ یا ستر مرتبہ۔ علماء تو یہاں گھبرا گئے کہ حضور ﷺ کے قلب پر پردہ کیسا مگر صوفیہ نے اس کی شرح کی ہے اس غین (۱) یا غیم کی پوری حقیقت تو وہی بیان کرسکتا ہے۔ جس کو وہ مقام حاصل ہو مگر مَالَا يُدْرِكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرِكُ كُلُّهٗ (اگر کل نہ پا سکے تو کل ہی ترک نہ کردے) کچھ کچھ نمونہ کے طور پر بیان کرنے میں مضائقہ بھی نہیں سو صوفیہ کہتے ہیں کہ آپ کا جو درجہ علیا ہے اس کے اعتبار سے بھی ایک مرتبہ ذکر کا اور ایک مرتبہ ذہول کا تھا گو واقع میں وہ ذہول نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی شان تو یہ تھی كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِىْ كُلِّ اَحْيَانِهٖ۔ آپ ہر وقت ذکر کرتے تھے۔

اقسام ذکر

مگر ذکر بھی دو قسم کا ہے ایک ذکر بواسطہ ایک ذکر بلاواسطہ جیسے محبوب کا مشاہدہ کہ ایک بواسطہ ایک بلاواسطہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مشاہدہ تو یہ ہے چہرہ پر نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا اور ایک یہ ہے کہ محبوب کہتا ہے کہ اس وقت ہماری طرف نگاہ مت کرو۔ آئینہ میں جو ہمارا چہرہ نظر آتا ہے اُسے دیکھو۔ ہے تو یہ بھی مشاہدہ ہی مگر دونوں درجوں میں بڑا فرق ہے اور عاشق کو طبعاً یہ واسطہ گراں (۲) ہوتا ہے۔ گو عقلاً گراں (۳) نہ ہو مگر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ بلا واسطہ مشاہدہ ہو وہ تو وسائط کے ارتفاع کی تمنا میں یہ کہتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ وہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ وہم (۴)

سو گو عاشق طبعاً اس واسطہ کو بھی گراں سمجھتا ہے مگر حکم ہے محبوب کا ہمیں اس وقت آئینہ ہی میں دیکھو اس لئے عقلاً اس سے راضی ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا

(۱) اس پردے کی (۲) طبیعت پر یہ بات بھاری معلوم ہوتی ہے (۳) چاہے عقلاً اس کو بھاری نہ سمجھے (۴) ''مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا چہرۂ انور نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں''۔

مقدمہ یہ کہ اہل اللہ نے ثابت کر دیا ہے کہ مخلوقات مراۃ جمال الٰہی ہیں کہ ان میں غور کرنے سے حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمالات کا پتہ چلتا ہے پھر مراتبت میں بھی مختلف درجے ہیں عوام کیلئے اور خواص کیلئے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾(۱)

اس میں اُلی الالبَاب(۲) کی قید سے فرق مراتب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور اسی آیت سے مخلوقات کا مرأۃ ہونا(۳) بھی معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں مقدمے سمجھ میں آگئے تو اب یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامور ہیں(۴) اصلاح امت کے اور یہ کام ہو نہیں سکتا تاوقتیکہ شفقت نہ ہو۔ اور شفقت کے لئے ضروری ہے توجہ الی المخلوق(۵) ہو۔ گو اس وقت بھی توجہ الی الخالق ہوتی تھی(۶) مگر تھوڑی سی توجہ مخلوق کی طرف بھی کرنا پڑتی تھی اور اس وقت مشاہدہ حق بواسطہ مراۃ(۷) کے ہوتا تھا اسی توجہ الی المخلوق(۸) کو آپ غین یا غیم (پردہ) سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور چونکہ اس پر آپ کو طبعاً قلق(۹) ہوتا تھا اس لئے استغفار کی کثرت فرماتے تھے تاکہ اس کا تدارک ہو جاوے تو جس کیفیت کا نام حضور کے درجہ کے اعتبار سے ذہول رکھا تھا وہ توجہ الی الحق بواسطہ تھی(۱۰)۔ یہ حالت اگر نقص کی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ تجویز ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی کمال ہے اور انسان کے لئے اس حالت کا ہونا حکمت ہے۔

رحمتِ شریعت

بہر حال دواماً استحضار ذکر تو کیا واجب ہوتا جو کہ فی ذاتہٖ مستحب ہی ہے استحضار تصدیق بھی دواماً واجب نہیں(۱۱) جو کہ فی ذاتہٖ واجب ہے۔ چنانچہ اسی

(۱) ''بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے میں البتہ دلائل ہیں عقل والوں کے لئے'' (۲) عقلمند (۳) آئینہ ہونا (۴) آپ کو امت کی اصلاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۵) مخلوق کی طرف توجہ (۶) خالق کی طرف توجہ (۷) حق کا مشاہدہ بواسطہ آئینہ ہوتا تھا (۸) مخلوق کی طرف توجہ کو (۹) طبعی رنج ہوتا تھا (۱۰) اللہ کی طرف بواسطہ توجہ کا نام ذہول رکھدیا (۱۱) نہ ہر وقت ذکر کرنا واجب نہ ہر وقت ایمان کا استحضار واجب۔

لئے شریعت نے اس حالت میں فتویٰ دیا ہے کہ مومن جاگنے میں بھی مومن ہے اور سونے میں بھی مومن اور حقیقت اور عقل کا فتویٰ یہ تھا کہ جاگنے میں تو مومن ہے اور سونے میں کافر۔ اب دیکھئے آپ شریعت کی رحمت (ہائے لوگ ایسی شریعت سے بھاگتے ہیں) اور آپ کو تحقیق ہوگیا کہ مثل تکوینات کے تشریعات میں بھی قدرت نے اس کی رعایت کی ہے کہ جو چیز جس قدر بھی زیادہ ضروری اور نافع ہوتی ہے اسی قدر اس میں سہولت فرمادیتے ہیں۔ اور سہولت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عبادت کی حقیقت سب کے ذہن میں ہے جیسا مفصلاً بالکل شروع تمہید میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کوئی بڑا ہی امر مہم ہے[۱] پس فَاعْبُدْهُ (سو اس کی عبادت کرتے رہو) میں اسی بڑی مہم چیز کا ذکر ہے اور اصل مقصود یہی حصہ ہے، باقی سیاق وسباق اسی کی تاکید وتمہید کے واسطے ہیں اور اسی آیت کے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایک مختصر جلسہ میں بیان کرچکا ہوں جس سے آج کی تقریر گو ایک گونہ تکریر[۲] تو ہوئی مگر ہر تکریر موجب ملال نہیں ہے۔

ہر تکرار قابل ملامت نہیں

دیکھئے دونوں ہاتھوں میں سے اگر ایک پر فالج گرجاتا ہے تو علاج کیوں کرتے ہو۔ اگر محبوب کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ پھوٹ گئی ہو تو کیوں کہتے ہو کہ حسن کم ہوگیا تو اسی طرح تکرار تلاوت یا بیان بھی موجب ملال نہ ہونا چاہئے۔ پھر تکرار بھی من کل الوجوہ نہیں کیونکہ گو آیت تو وہی تلاوت کی ہے مگر آج کے بیان میں مضامین کی جدت ضرور ہے۔ چنانچہ اس بیان سابق میں عبادت کی حقیقت اجمالاً بیان کی تھی۔ مگر تفریعات[۳] رہ گئی تھی، اس لئے آج پھر وہی آیت اختیار کی تاکہ جو مضمون اس کے متعلق رہ گیا ہے اسے بھی بیان کردیا جائے۔ سو عرض کرتا ہوں۔

(۱) بہت مہتم بالشان حکم ہے (۲) اگرچہ مکرر ہے لیکن ہر تکرار باعث ملامت نہیں ہوتا جیسے آنکھیں دو ہیں ہاتھ پیر دو دو ہیں ان میں بھی تکرار ہے لیکن کوئی ان کو قابل ملامت نہیں سمجھتا (۳) آیت کا اجمالی بیان تو ہوگیا تھا کچھ فروعی باتیں رہ گئیں تھیں۔

شانِ الٰہی کا مقتضاء

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل علیٰ شانہ تربیت کرنے والے ہیں آسمانوں کے اور زمین کے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ جب یہ شان ہے کہ وہ سب کے مربی و محسن ہیں اور مَا بَيْنَهُمَا (جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں) میں وہ تمام چیزیں آ گئیں جن سے تمہیں بھی منافع پہنچ رہے ہیں۔ تو وہ مربی ہیں تمہارے بواسطہ بھی اور بلاواسطہ بھی۔ کیونکہ جو اسباب تمہارے حدوث و بقا کے ہیں وہ ان کے بھی مربی ہیں تو وہ اعلیٰ درجہ کے محسن ہوئے تو اس شان کا مقتضا یہ ہے کہ ان کا حق ادا کرو یعنی فَاعْبُدْهُ ان کی عبادت کرو۔ عبادت کے معنی ہیں عبد شدن (۱) مگر بعضے محاورات جو کثیر الاستعمال ہیں ان کے مفصل معنی کا ذہن سے اکثر ذہول ہو جاتا ہے (۲) اور وہ لفظ بھی خود اپنے معنی کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔

عبادت کی حقیقت و معنی

لفظ عبادت بھی ایسا ہی ہے کہ اس کے مفصل معنی عبد شدن (بندہ ہونا) ہیں مگر بجائے اس معنی کے اب خود لفظ عبادت ہی ذہن میں آ کر رہ جاتا ہے۔ کلام لفظی کے درجہ میں بھی دونوں درجوں میں صرف عبادت ہی آتا ہے اور اس کا دوسرا عنوان اتنا مستعمل نہیں اس لئے وہ ذہن میں نہیں آتا۔ یعنی عبد شدن غلام ہو جانا۔ اسی عارض کے سبب حقیقت عبادت کی بہت لوگوں پر مخفی ہو گئی تو اب فَاعْبُدْهُ کے معنی یہ ہوئے کہ غلام ہو جاؤ۔ یہ حاصل ہوا اس آیت کا اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امر اس درجہ تو ضروری ہے کہ حق تعالیٰ نہایت تمہید و تاکید کے ساتھ اس کا حکم فرما رہے ہیں مگر ہماری حالت کیا ہے۔ کہ اس کی ذرا قدر نہیں اور قدر اس لئے نہیں کہ توجہ نہیں۔ شاید کوئی کہے کہ ہم تو عبادت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں محض اعتقاد و تلفظ کافی نہیں۔ کیونکہ جو غایت ہے ضروری سمجھنے کی جب وہ حاصل نہ ہوئی تو کیونکر معلوم ہو کہ آپ نے اس کو ضروری سمجھا

(۱) بندہ ہونا (۲) ذہن سے اکثر نکل جاتے ہیں۔

مسلم ہے کہ اَلشَّیُ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَۃٍ لَغَا۔ جب کوئی شئے اپنے فائدہ سے خالی سمجھی جاتی ہے تو وہ منتفی ومعدوم (۱) ہوجاتی ہے۔ ضروری سمجھنا تو ایسا ہوتا ہے جس طرح تم دوا کو ضروری اور مفید سمجھتے ہو اور استعمال کرتے ہو اور قاعدہ کے موافق نسخہ بناتے ہو حکیم کے کہنے پر چلتے ہو، پرہیز بھی کرتے ہو اور جب اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تو استعمال بھی نہیں کرتے اسی طرح عبادت ہے کہ جو ضروری سمجھے گا وہ اس کو پابندی سے ادا کرے گا اور قاعدہ کے موافق ادا کرے گا اور جو اس کے ساتھ پرہیز ہیں ان کو بھی لازم سمجھے گا اگر ایسا نہ کیا تو وہ ضروری سمجھنا معتبر نہ ہوا اس پر شاید آپ اپنے دل میں خوش ہوں گے کہ ہم تو پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں اس لئے ہم تو عبادت کرتے ہیں۔ ہاں لغۃً بیشک آپ پر مصلی صادق (۲) آگیا مگر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ صرف عید بقرعید کی نماز پڑھ لیتے ہیں لغت کے اعتبار سے تو مصلی وہ بھی ہیں مگر انہیں آپ بھی نمازی نہ کہیں گے کیونکہ محاورہ میں نمازی اس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہوں اگر کسی نے ایک دن باپ کی اطاعت کی اور حاکم کی تعظیم کی اور ایک دن نہ کی تو کیا اسے مودب ومہذب کہیں گے۔ لغۃً تو کہیں گے مگر محاورہ میں نہیں کہیں گے کیونکہ اس محاورہ میں لغت سے کچھ اضافہ ہے۔ ادب کرنے والا محاورہ میں اس کو نہیں کہیں گے جو ایک دن کرے اور ایک دن نہ کرے۔

عابد کی تعریف

اسی طرح قرآن وحدیث بھی محاورات میں ہے۔ تو شرعاً عابد اسی کو کہیں گے جو دوام کرے غلامی پر دیکھئے اگر کوئی غلام ایسا کرے کہ کھانا تو آقا کے سامنے لاکر رکھدے اور پانی مانگنے کے وقت انکار کردے کہ پانی تو میں نہیں لاؤں گا، اسے آپ فرمانبردار کہیں گے یا سرکش (۳)۔ یقیناً سرکش کہیں گے اسی طرح

(۱) وہ چیز ختم ہوجاتی ہے (۲) لغت کے اعتبار سے بیشک آپ کو نماز پڑھنے والا کہہ سکتے ہیں (۳) نافرمان۔

ننانوے حکم آقا کے مانے اورصرف ایک نہ مانے تب بھی وہ سرکش ہی کہلائے گا۔ چہ جائے کہ ہماری طرح ایک مانے اور ننانوے نہ مانے اگر کوئی کہے کہ ہم تو خدا کے احکام مانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ تمام اوامر ونواہی(۱) میں اپنی حالت جانچ لیں کہ کل کو مانتے ہیں یا نہیں۔ جانچنے کے بعد معلوم ہوجائیگا کہ واقع میں تم اپنے کو محض زبان سے غلام بتاتے ہو مگر حقیقت بھی غلامی کی نہیں سمجھتے بس وہی حالت ہے کہ بچّے تو کریں گے تے بے زبر تب اور بے تے زبر بت اور رواں کہیں گے بطخ کہ بچّے میں تو ہم غلام بنتے ہیں۔ اور جب غلامی کرنے کا وقت آتا ہے تو بطخ بن جاتے ہیں ارے بھائی یہ تو تبت ہوا تھا بطخ کہاں سے ہوا۔ یاد رکھو غلام تو وہی ہے کہ جو بغیر اگر مگر کے ہر امر میں(۲) آقا کی اطاعت کرے اس معیار کو سمجھ کر دیکھئے کیا آپ واقعی غلام ہیں تو بہت سے تو ایسے نکلیں گے جو عبادت کرتے ہی نہیں اور بعضے کرتے ہیں تو پابندی سے نہیں کرتے ہیں اور جو پابندی بھی کرتے ہیں وہ قاعدہ سے نہیں کرتے ہیں یوں ہی بے ڈھنگی ادا کرتے ہیں اور بعضے وہ ہیں جو احکام الٰہیہ میں شبہات نکالتے ہیں۔ صاحبو کیا اسی کا نام غلامی ہے ہرگز نہیں یہ تو غلامی کا دعویٰ ہے حقیقت غلامی نہیں۔

علماء اور حکام کا اتباع

اور ضرورت اس کی ہے اور گو اس کا اہتمام فرداً فرداً ہر شخص پر فرض ہے مگر اس کے اہتمام و انتظام میں جن جماعتوں کا زیادہ دخل ہے وہ دو گروہ ہیں جو مخلوق کو خدا کا حقیقی غلام بنا کے اطاعت کرا سکتے ہیں اس میں ایک تو علماء کا گروہ ہے ان کا بڑا اثر ہوتا ہے اگر یہ خدانخواستہ گمراہ ہوں تو سارے عالم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔

(۱) تمام احکامات اور منہیات میں (۲) ہر حکم میں۔

زَلَّةُ الْعَالِمِ زَلَّةُ العَالَم (عالم کی لغزش جہاں کی لغزش ہے) اور دوسرا امراء کا ہے علماء کا عوام پر دینی اثر ہے اور امراء کا دنیوی۔ علماء کا دینی اثر تو یہ ہے کہ ان کی اعتقادی وجاہت ہے اور ان کے احکام کی قلب میں قدر ووقعت ہے۔ وہ عوام کو وعظ ونصیحت کرتے ہیں تو اس سے کچھ آخرت کے اجر کی طمع [۱] اور کچھ وہاں کے عذاب کا خوف پیدا ہوتا ہے اور امراء کے احکام کا اثر ان کے دنیوی اقتدار کے خوف یا طمع [۲] سے ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں جگہ خوف بھی ہے اور طمع بھی۔ ایک جگہ آخرت کا ایک جگہ دنیا کا۔ بس یہ وہ گروہ تھے جو خود غلام بن کے اپنا نمونہ پیش کرتے تو پھر عوام بھی ان کے ساتھ ہوتے۔

صوفیہ کا طبقہ

اور اب تو ایک تیسرا فرقہ خوامخواہ پیدا ہوگیا ہے۔ اور وہ فرقہ کون ہے وہ صوفیہ کرام کا گروہ ہے۔ حالانکہ یہ کوئی نیا گروہ نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت میں یہ وہی علماء ہیں مگر علماء نے ایک کام چھوڑ دیا اس وجہ سے یہ تیسرا گروہ پیدا ہوگیا۔ وہ کام کیا ہے۔ مجاہدہ وریاضت کیونکہ ذرا یہ کام ہے مشکل، کہ کھانا چھوڑ دو۔ لوگوں سے ملو جلو نہیں، اچھا کپڑا مت پہنو۔ ٹھنڈا پانی مت پیو۔ اور چند روز سے صوفیت کی یہی تعریف رہ گئی ہے تو جن لوگوں نے اس کو اختیار کرلیا وہ صوفی کہلانے لگے خواہ ان کو نہ علم ہو نہ عمل تو اس طرح سے یہ تیسرا فرقہ ہوگیا حالانکہ صوفیت واقع میں اور ہی چیز ہے جسے ان باتوں سے کچھ بھی تعلق نہیں اور یہ بھی تصوف کی تعریف کچھ دنوں پہلے تک تھی اور اب تو اس سے بھی سہل [۳] صوفیت نکلی ہے کہ کپڑے رنگ لئے بال بڑھا لئے تسبیح پڑھ لی تھوڑا سا ذکر کرلیا۔ بس لوگ معتقد ہوگئے۔ اور وہ گناہ بھی

(۱) ثواب کا لالچ (۲) خوف یا لالچ (۳) آسان۔

کریں تو بھی بزرگی نہیں ڈھلتی(۱)۔ بس ہیں یہ بڑے مزہ میں نہ بولے تو چپ شاہ اور اگر بولے اور بے ڈھنگی بولے تو صاحب رموز(۲) ہیں۔ اور ڈھنگ کی بولے تو عارف ہیں۔ خرابی تو بیچارے مولوی کی ہے کہ کہیں ایک بھی مسئلہ غلط کہا تو قلعی کھل گئی(۳) اور صوفی صاحب کیسی ہی غلطیاں کریں مگر وہ صاحب رموز ہیں پھر اوپر سے معتقدین کا ہر بات میں حضور حضور کرنا طرہ بردستار ہوگیا(۴) یہ انہیں اور زیادہ خراب کرتے ہیں۔

امراء اوران کے خوشامدی

جیسے ایک امیر تھے وہ جھوٹ بہت بولا کرتے تھے اوران کا ایک مصاحب ان کے جھوٹ کی توجیہ کیا کرتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے بیان کیا کہ میں شکار کو گیا ایک ہرن پر جو گولی چلائی تو سم کو توڑ کے ماتھے کو پھوڑ کر(۵) نکل گئی۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے کہ کہاں سم کہاں ماتھا(۶)۔ مصاحب(۷) نے فوراً توجیہ کی کہ ہاں حضور اس وقت وہ کھجلا رہا تھا(۸) امراء کے یہاں تو رات دن ایسے خوشامدی مصاحب رہتے ہی ہیں۔

مگر مشائخ کے یہاں بھی اب ایسے ہی معتقد رہ گئے ہیں کہ خوامخواہ رات دن ان کی کرامتوں کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اوران کے عیب کو ہنر بتلاتے ہیں۔

حقیقی علماء وصوفیہ

تو بہرحال علماء میں سے ایک شاخ نکل کر فقراء بن گئی۔ مگر واقع میں

(۱) اُن کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا (۲) اللہ کے رازوں کو سمجھنے والے (۳) پول کھل گیا (۴) لوگوں کا ہر وقت انہیں حضرت حضرت کہنا ان کے لئے طغرائے امتیاز ہوگیا(۵) پیر کے کُھر میں لگی پھر اس کی پیشانی توڑتی ہوئی سر میں سے نکل گئی (۶) کہاں کُھر اور کہاں پیشانی (۷) ان کے ساتھی نے فوراً تاویل کی (۸) پیر سے اپنا سر کھجا رہا تھا اس لئے گولی پیر میں لگ کر سر میں سے ہوتی ہوئی گذر گئی۔

صوفیہ علماء ہی ہیں۔ اور جو جاہل ہو وہ صوفی ہی نہیں۔ اور احادیث میں جن علماء کی فضیلت آئی ہے وہ واقع میں وہی علماء ہیں جو صوفی بھی ہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَالْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ)(۱) یعنی جسم انسانی میں ایک پارہ گوشت ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے خبردار رہو وہ قلب ہے۔ تو جس نے اپنے قلب کی اصلاح نہ کی ہو اور اس لئے اس کی تمام عملی حالت تباہ ہو وہ کیونکر عالم مورد فضائل واردہ(۲) کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ بہرحال علماء وہی ہیں جو صوفیہ ہیں اور جن علماء کے فضائل نصوص (۳) میں وارد ہیں وہی علماء ہیں جو درویش بھی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ (اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاء) یعنی خوف وخشیت خدا سے صرف علماء ہی کو حاصل ہے۔ اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ مراد ہیں کیونکہ خشیت کاملہ ان ہی میں ہے۔ اسی طرح علماء کو ورثۃ الانبیــاء کہا گیا ہے اس بنا پر کہ انبیاء نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ زراعت نہ تجارت انہوں نے صرف علم چھوڑا تو جن کے پاس یہ علم موروث انبیاء ہوگا وہی لقب عالم کا مستحق ہوگا۔

علمِ حقیقی

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کا علم یہ علم رسمی نہ تھا علم حقیقی وقلبی تھا جس کی شان یہ ہے ؎

علم چوں برتن زنی مارے شود   علم چوں بردل زنی یارے شود(۴)

(۱) تفسیر القرطبی/۱/۲۳۲ (۲) اسے کب ایسا عالِم کہہ سکتے ہیں جس کے بارے میں احادیث میں فضیلتوں کا ذکر ہے (۳) قرآن وحدیث میں (۴) ''علم کا جب قلب پر اثر ہوگا تو وہ وصول الی اللہ میں معین ہوگا اور اگر تن پر اثر ہوا تو نرا بوجھ اور وبال ہوگا''۔

دوسرے محقق کہتے ہیں ۔

علم رسمی سربسر قیل ست وقال نے از و کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت وردلت افزوں کند(۱)

اور ہماری حالت کیا ہے اسے بھی بیان کرتے ہیں ۔

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَہ کُلُّمَا حَصَلْتُمُوْہُ وَسْوَسَہ
علم نبود غیر علم عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی(۲)

تو حضرت وہ علم جو انبیاء نے چھوڑا وہ یہ ہے کہ جس کے خواص آپ نے سنے اور جو اس علم کے عامل ہیں وہ ہیں نائب رسول اور ورثۃ الانبیاء تو حقیقت میں درویش ہی علماء ہوئے۔ غرض دو طبقے ایسے ثابت ہوئے جن کی اصلاح سب سے مقدم ہے کیونکہ ان کا اثر سب سے زیادہ ہے اس لئے اگر یہ گمراہ ہوں گے تو سب کو گمراہ کریں گے۔ سو افسوس یہ ہے کہ عبادت کے متعلق یہ طبقے بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں تو عوام کیونکر غلطیوں سے بچتے۔

عبادت کی حقیقت اور مواقع

چنانچہ منجملہ ان غلطیوں کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ عبادت کے معنی غلط سمجھتے ہیں کہ صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وغیرہ خاص اعمال میں منحصر سمجھتے ہیں اس لئے

(۱) رسمی علم محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہو نہ حال علم وہی ہے کہ تم کو خدا کا راستہ دکھلا دے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے حرص وہوا سے چھڑا کر دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت پیدا کردے (۲) تم کو اس کے علاوہ کچھ نہیں پتا کہ یہ چیز جائز ہے یہ ناجائز اپنے بارے میں تجھ کو پتا ہی نہیں کہ تو حور ہے یا بوڑھی کھوسٹ۔ جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا۔ علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے۔

دوسرے اعمال میں کوتاہی کرنا عجیب نہیں کہ وہ ان کو عبادت ہی نہیں سمجھتے۔ مگر لکھے پڑھوں کی غلطی نہایت سخت ہے کہ وہ عبادت کے معنی بھی جانتے ہیں کہ اطاعت مطلقہ ہیں پھر اس میں غلطی کرتے ہیں کہ اس کے محل سے ناواقف ہیں یا بے پرواہ ہیں اور یہی مراد ہے صحیح معنی نہ سمجھنے سے۔ یعنی معنی تو سمجھے مگر صحیح نہیں سمجھے۔ اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ اس جلسہ میں زیادہ تر طلبہ موجود ہیں تو عرض کروں کہ اطاعت مطلقہ کے محل کیا کیا ہیں سو سنئے کہ سب سے اول محل تو عقائد ہیں یعنی جس طرح شریعت نے عقائد سکھلائے ہیں اسی کے موافق اعتقاد رکھیں۔ دوسرا محل اعمال دینیات ہیں۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ انہیں بھی شریعت کے موافق پابندی سے صحیح طور پر ادا کریں۔ تیسرا محل معاملات ہیں بیع وشراء وغیرہ کہ ان کو بھی احکام شرع کے مطابق کریں اور یہ معلوم کریں کہ کونسی بیع فاسد(۱) ہے اور کونسی باطل، کونسا معاملہ صحیح ہے اور کونسا فاسد۔ کس معاملہ میں ربوا(۲) لازم آتا ہے اور کس میں قمار(۳) یہ سب شریعت سے معلوم کر کے اسی کے موافق عمل کیا کریں۔ چوتھا محل معاشرت ہے کہ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ملنا جلنا اس کو معلوم کریں کہ اس کے شریعت میں کیا آداب ہیں۔ پانچواں محل اخلاق ہیں۔ اخلاق کے یہ معنی نہیں کہ نرمی سے بول لئے یا تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے یا ادب سے سلام کرلیا۔ یہ تو آثار ہیں اخلاق کے۔ خود اخلاق نہیں، اخلاق یہ ہیں تواضع ۔ صبر۔ شکر۔ زہد و قناعت شوق ورضا وغیرہ یہ ہیں اخلاق یعنی اعمال باطنی ان کے مقابلہ میں ان کے اضداد ہیں۔ کبر بے صبری۔ ناشکری۔ طمع وحرص حسد۔ بغض ۔کینہ، یہ اخلاق ذمیمہ ہیں ۔تو اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عبادت کیا ہے۔ عبادت ان تمام شعبوں کی تکمیل کا نام ہے۔

---

(۱) تجارت کا کونسا طریقہ خراب ہے (۲) سود (۳) جوا۔

عبادت میں کی جانے والی کوتاہیاں

اب اس میں غلطی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعضے یہی نہیں جانتے کہ ان پانچ میں اصل کیا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ تصحیح عقائد کی فکر نہیں کرتے گو کسی قدر اعمال کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور بعضے یہ تو جانتے ہیں کہ ان میں اصل عقیدہ ہے۔ یہی راس العبادات اور اساس العبادات ہے (۱)۔ کہ بغیر اس کے کچھ بھی صحیح نہیں مگر ان سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ جب اسے بڑا سمجھ لیا تو ان کے نفس نے یہ کہا کہ بڑے کے سامنے چھوٹے کی چنداں (۲) ضرورت نہیں۔ ننانوے کے ہوتے ہوئے ایک کی کمی چنداں (۳) مضر نہیں۔ تو ان کی نظر سے اعمال کا اہتمام جاتا رہا۔ چنانچہ بہت لوگ جو عقائد حقہ رکھنے والے ہیں اور ان کے اعمال بھی درست ہیں۔ وہ اگر کسی کے عقائد درست دیکھتے ہیں۔ گو اعمال درست نہ ہوں تو تسامح کرتے ہیں (۴) اور اس سے نفرت نہیں کرتے یعنی اتنی نفرت بھی نہیں کرتے جتنی شرعاً کرنی چاہیے۔ بلکہ تعریف کے طور پر کہہ دیتے ہیں کہ فلانے کے عقائد بہت اچھے ہیں گو وہ رشوت بھی لیتا ہو ظلم بھی کرتا ہو بے نماز بھی ہو مگر عقائد صحیح ہونے کی وجہ سے اس کی کسی بات سے نفرت نہیں۔ مثلاً کوئی نماز نہ پڑھے تو اس سے انہیں نفرت نہیں حالانکہ (مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ) ''جس نے قصداً نماز ترک کردی مثل کافر کے ہوگیا'' میں فَقَدْ كَفَرَ نفرت ہی کی تو دلیل ہے کہ شریعت نے تارک الصلوٰۃ کو مثل کافر کے اسی لئے تو فرمایا تاکہ مصلین (۵) ترک صلوٰۃ نہ کریں۔ اور تارک صلوٰۃ نمازی بن جاوے۔ اور تارک صلوٰۃ کو بھی اپنی حالت سے نفرت ہو اور نماز شروع کردے مصلی اس سے نفرت ظاہر کرے تعلق قطع کرے اور خلا (۶) ملا نہ رکھے مگر

(۱) یہی تمام عبادات کی اصل اور بنیاد ہے (۲) کوئی ضرورت نہیں (۳) ایک کی کمی کوئی نقصان کا باعث نہیں (۴) چشم پوشی کرتے ہیں (۵) نمازی (۱) میل جول۔

ساتھ ہی اپنے کو مقدس اور اس کو حقیر نہ سمجھے۔ یہاں تو قدم قدم پر لغزشیں اور رہزن(۱) موجود ہیں۔ یا تو بے نمازی سے نفرت نہ کریں گے یا کریں گے تو اپنے کو مقدس سمجھیں گے جو کہ کبر ہے جو کہ ترک نماز سے بھی قبیح ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ بے نمازی کو سلام کرنا کیسا ہے۔ اور سوال کیا تحقیر کے لہجہ میں مجھے لب ولہجہ سے معلوم ہو گیا کہ منشاء اس سوال کا کبر ہے اگر مجھ سے پوچھتے کہ اس کی دلیل کیا تو یہ میں نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے نبض دیکھ کر طبیب کہتا ہے کہ تم کو پُرانا بخار ہے۔ اب تم عطائی ہو وہ تمہیں کیونکر سمجھائے اسی طرح میں دلیل نہیں بتا سکتا۔ لیکن ہاں حق تعالیٰ کی یہ ایک نعمت ہے کہ مجھے لب ولہجہ سے اکثر قلبی حالت کا پتہ چل جاتا ہے اور یہ فیض ہے محبت سنت کا حق تعالیٰ حضور ﷺ کی شان میں فرماتے ہیں: وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ (اور آپ ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے) جب سنت سے ایسا فہم حاصل ہو جاتا ہے اس کا کوئی قاعدہ کلیہ بیان نہیں ہو سکتا۔

نادان طبیب

اگر اس کے لئے کوئی دلیل بیان کی جائے گی تو اس کی وہ گت ہوگی۔ جیسے ایک طبیب کے صاحبزادے تھے اناڑی ان کے باپ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ انہیں بھی ساتھ لے گئے جا کے مریض کی نبض دیکھی تو نبض سے اتنا معلوم ہوا کہ کوئی بد پرہیزی ہوئی ہے۔ اتفاق سے وہاں چار پائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے بھی پڑے تھے تو طبیب نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے نارنگی کھائی ہے۔ واقعی مریض نے

(۱) ڈاکو۔

نارنگی کھائی تھی۔ اب صاحبزادے نے ایک قاعدہ کلیہ اخذ کیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہو وہ ضرور مریض کی کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اتفاق سے وہ طبیب مر گئے۔ اب صاحبزادے ان کے قائم مقام ہوئے۔ ایک مریض کو دیکھنے گئے اس کی چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا تھا کہنے لگے معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے۔ اس نے کہا واہ صاحب کہیں نمدہ بھی کھایا جاتا ہے۔ کہنے لگے صاحب نبض سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ مریض نے کہا نکالو اس کو اس کی دم میں نمدہ(۱) تو جس طرح بخار پہچاننے کے لئے محض سرعت نبض کافی نہیں۔ بلکہ ایک ذوق کی ضرورت ہے جس سے طبیب کو پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح لب ولہجہ سے پہچان لینا یہ بھی ذوقی امر ہے۔ اور یہ کوئی بزرگی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تو مناسبت سے حاصل ہو جاتا ہے جو خدمت خلائق کے کام کرنے والے کو حق تعالیٰ عطا فرما دیتے ہیں۔

گناہوں سے نفرت کا مطلب

خلاصہ یہ کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس سوال کا سبب کبر ہے اس لئے میں نے کہا کہ تمہارے واسطے تو یہی ضروری ہے کہ فاسق کو ابتداءً سلام کیا کرو۔ غرض نفرت کی بھی قسمیں ہیں۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ کبھی متکبرین کو سند مل جائے۔ چنانچہ جنہیں تقویٰ کا ہیضہ ہوتا ہے وہ خدا جانے مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ یاد رکھو اہل معاصی سے نفرت کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے اور تکبر کرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تو سب سے کم سمجھے اور پھر شریعت کے حکم کی وجہ سے نفرت کرے اور یہاں بڑا زبردست اشکال ہے وہ یہ کہ تواضع کا اقتضا(۲) یہ ہے کہ کسی سے بھی نفرت نہ کرے اور بغض فی اللہ (۳) کا مقتضا یہ ہے کہ عاصی سے نفرت

(۱) اوہ اونی کپڑا جو گھوڑے کی پیٹھ پر زین کے نیچے ڈالتے ہیں (۲) تواضع اختیار کرنے کا تقاضا یہ ہے (۳) اللہ کے لئے بغض رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ گناہگار سے نفرت کرے۔

کرے اور نفرت جب کرے گا تو ضرور اسے کمتر سمجھے گا۔ اور جب اسے معصیت کے سبب کمتر سمجھے گا تو پھر اپنے کو (معصیت سے محفوظ ہے) اس سے کیسے کمتر سمجھے گا۔ اسی واسطے کسی غیر محقق نے تنگ ہوکر کہدیا ہے ۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش(۱)

مگر محقق دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیتا ہے کہ دریا میں بھی جائے اور خشک دامن بھی رہے اس کو ایسا تیرنا آتا ہے کہ کھڑے ہوکر تیرتا ہے اس کی حقیقت نہایت ہی آسان ہے محققین نے اس کو بھی حل کردیا ہے۔ ایک مثال اس کے لئے کافی ہے کہ مثلا بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ شہزادے نے فلاں جرم کیا ہے اس کو ایک درجن بید لگاؤ(۲)۔ اب یہاں دو حکم ہیں ایک تو یہ کہ یہ شہزادہ ہے اسے عظیم الشان سمجھو اور دوسرا یہ کہ اس نے ایک قصور کیا ہے اس لئے مجرم بھی سمجھو۔ اب وہ بھنگی جانتا ہے کہ یہ سزا کے قابل ہے اور میں سزا کے قابل نہیں۔ اس حیثیت سے میں افضل ہوں مگر باوجود اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں بھنگی ہوں اس لئے باوجود مجرم ہونے کے بھی یہ مجھ سے بدرجہا افضل ہے۔ دیکھئے دونوں امر کس طرح جمع ہوگئے اور بھنگی بادشاہ کے امتثال کے لئے تو مارتا ہے اور اپنے اعتقاد سے تعظیم کرتا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھو کہ جب تم کسی مسلمان سے معصیت کی وجہ سے نفرت کرو تو اس کے ساتھ یہ بھی سمجھو کہ ممکن ہے کہ عنداللہ اس کا رتبہ مجھ سے اس لئے بڑھا ہوا ہو کہ اس میں کوئی دوسرا کمال ایسا ہو جو مجھ میں نہ ہو مگر اس حیثیت سے کہ یہ بے نمازی ہے حکم شاہی ہے کہ بے نمازی کو سلام نہ کرو۔ اس واسطے میں سلام نہیں کرتا۔ باقی میں اس سے افضل نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ کسی خفی عمل (۳) کی بدولت یہ عنداللہ مجھ سے افضل ہو کہ کیونکہ اعمال کا انحصار نماز ہی

(۱) ''گہرے دریا میں تختہ میں باندھ کر ڈالدیا پھر کہتے ہو خبردار رہ کہ دامن تر نہ ہو'' (۲) بارہ ڈنڈے مارو (۳) کسی پوشیدہ عمل کی وجہ سے۔

میں نہیں ہے، ممکن ہے کہ توحید اس کی اتنی خالص ہو کہ بلامحاسبہ بخشا جائے تو آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ عنداللہ بھی میں اس سے افضل ہوں اور وہ تو پھر مسلمان ہیں۔ محققین تو کفار کے بارے میں بھی یہ خیال رکھتے ہیں ۔

ہیچ کافر را بخواری منگرید — کہ مسلماں بودنش باشد امید(۱)

ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مرے۔ تو پھر کیا خبر ہے کہ وہ افضل ہوگا یا آپ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے میں نے کہا اس شخص کو جائز ہے جسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا خاتمہ یزید سے اچھا ہوگا۔ ارے اپنے کام میں لگو لعنت کا وظیفہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

دوسروں پر لعنت کرنا

حضرت رابعہ سے کسی نے پوچھا تم ابلیس پر لعنت نہیں کرتی، کہنے لگیں جتنی دیر میں اس پر لعنت کروں میں اپنے محبوب کی یاد ہی نہ کروں۔ لعنت کے باب میں بعضوں کا دوسرا مذاق بھی ہے۔ ایک شخص تھا وہ روز ایک ہزار مرتبہ شیطان پر لعنت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس دشمن نے بھی کیسا بدلا لیا کہ دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ اس نے آکر جگا دیا کہ اٹھو اُٹھو بھاگو یہ جیسے ہی وہاں سے ہٹا دیوار گر پڑی یہ بہت خوش ہوا کہ یہ تو کوئی بڑا خیر خواہ ہے۔ پوچھا تم کون ہو کہا نام نہ پوچھو نام سن کر تم خوش نہ ہوگے۔ کہا صاحب بتلاؤ بھی۔ کہا میں وہی شیطان ہوں جس پر تم ہزار مرتبہ روزانہ لعنت بھیجا کرتے ہو۔ کیا تم تو میرے بڑے خیر خواہ نکلے۔ اس نے کہا کہ میں نے خیر خواہی سے نہیں بچایا بلکہ اس خیال سے بچایا کہ دیوار کے نیچے دب کے مرو گے تو شہید ہو جاؤ گے اور بے حساب بخشے جاؤ گے۔ تو مجھے فکر ہوئی کہ کسی طرح

(۱) ''کسی کافر کو حقارت سے نہ دیکھو اس لئے کہ اس کے مسلمان ہونے کی امید ہے''۔

اتنے بڑے ثواب سے محروم کردوں دوسرے اگر جیتا(۱) رہیگا تو تجھ پر خوب مشق کیا کروں گا۔ ابھی بہت دن نچاؤں گا جیسے بندر ریچھ کہ اگر مرجاوے تو بندر والا پھر کہاں سے کمائیگا۔ بہرحال کسی پر لعنت کرنا فضول حرکت ہے۔ جب کہ اپنے ہی حال کی خبر نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

گہ رشک بروفرشتہ برپاکی ما گہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما

ایماں چو سلامت بہ لب گور بریم احسنت بریں چستی وچلاکی ما(۲)

جب خاتمہ ہوگا اس وقت معلوم ہوگا کہ کس حالت میں گئے بس تو پھر کیا منہ لے کے کسی کو کہیں۔ جس پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو وہ میونسپلٹی کے چار آنہ آٹھ آنہ والے جرمانہ کے مجرم پر ہنسے تو کیا یہ حماقت ہی نہیں۔ اور جب یزید وابلیس پر بھی لعنت کرنا فضول یا خطرناک ہے تو مسلمان کی غیبت کیا کچھ ہوگی اور آج کل تو اس سے بڑھ کر یہ تماشا ہے کہ غیبت کے لئے بھی صلحاء واتقیاء ہی تجویز کئے جاتے ہیں۔

غیبت سے احتراز

چنانچہ مشائخ کی مجلسوں میں اکثر دوسرے مشائخ وعلماء کی ہی غیبتیں ہوا کرتی ہیں جہاں فساق کی بھی پردہ دری جائز نہیں تھی۔ غرض کسی کو حقیر مت سمجھو۔ ابھی خود تمہاری ہی کشتی مجدھار(۳) میں ہے۔ البتہ جہاں شریعت اجازت دے وہ مواقع مستثنیٰ ہیں باقی جہاں اجازت نہیں وہاں غیبت کرنا خصوصاً سب کام چھوڑ کے اسی کا شغل کرلینا میں اس کو منع کررہا ہوں بالخصوص جبکہ نہ اپنا انجام معلوم ہو نہ اس کا جس کی غیبت کررہے ہو اسی پر کسی نے متنبہ کیا ہے ؎

(۱) اگر زندہ ہوگے (۲) ''کبھی ہماری پاکی پر فرشتہ رشک کرتا ہے کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان ہنستا ہے۔ ایمان اگر قبر میں سالم لے جائیں اس وقت ہماری چستی وچالاکی پر آفریں ہے'' (۳) بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔

غافل مرد کہ مرکب میدان مردرا درسنگلاخ بادیہ پیا بریدہ اند(۱)
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند(۲)

تو جن کے لئے ترک سلام کا حکم ہے وہاں دو حیثیتیں ہیں۔ایک تو یہ کہ ترک اس حیثیت سے کہ ہم اس سے افضل ہیں یہ تو ممنوع ہے۔ اور ایک اس حیثیت سے کہ یہ حکم شرع ہے۔ یہ مطلوب و مامور بہ ہے اور وہ بھی وہاں جہاں ترک میں مصلحت ہو ورنہ جہاں مفسدہ کا احتمال ہو وہاں جائز نہیں مثلاً یہ اندیشہ ہو کہ اس سے اور ضد بڑھ جاوے گی اور اس شخص کا دین اور تباہ ہوگا۔

اتباع شیخ کی ضرورت

اسی واسطے تو دین میں ہر جگہ حکیم کی ضرورت ہے۔ ہر کام میں کسی محقق کو اپنا رہبر بناؤ اور اس سے ایک ایک جزئی پوچھو البتہ اس کے انتخاب میں بڑے غور وخوض کی ضرورت ہوگی۔اب اول تو انتخاب ہی میں غلطی ہوتی ہے۔اور اگر انتخاب بھی صحیح ہوا تو اتخاذ شیخ اس واسطے کرتے ہیں کہ ان سے مقدمات میں دعا کرایا کریں گے۔تعویذ گنڈے کرایا کریں گے۔ گویا شیخ ان کے نوکر ہیں ششماہی(۳) نذرانہ تنخواہ میں پاتے ہیں اور اگر زیادہ خوش اعتقاد ہوئے تو اس خیال سے پیر بناتے ہیں کہ بس وہ خدا کے ہاں بخشا لیں گے، چاہے وہ خود بھی نہ بخشے جائیں۔ حضرت شیخ ان کاموں کے لئے نہیں ہیں، وہ تو طبیب ہیں ان کے سامنے اپنے امراض ظاہر کرو اور ان سے اپنی حالت کا فیصلہ کراؤ اور جو وہ علاج بتلائیں اس پر عمل کرو۔ جب ایسا انتظام ہوگا تو حضرت اس بارے میں بھی شیخ ہی کے مشورہ پر عمل ہوگا کہ کہاں سلام نہ کریں اور کہاں کریں۔ کہاں مصلحت ہے اور کہاں مفسدہ ہے

(۱)''غافل مت چل اس لئے کہ مرد میدان نے سخت جنگلوں میں گھوڑا دوڑایا ہے'' (۲)''ناامید بھی مت ہو کہ رند شرابی لوگ ایک نالہ میں منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں'' (۳) ہر چھ ماہ بعد بطور تنخواہ کچھ نذرانہ دیدیا جاتا ہے۔

یار باید راہ را تناہ مرو بے قلاؤز اندریں صحرا مرو(۱)

اور اگر کسی کے پاس رہبر محقق نہیں ہے تو وہ اگر دین پر عمل کرنا چاہے گا تو صورت دین پر عمل کرنا آجائے گا۔ مگر حقیقت دین پر عمل کرنا مشکل ہوگا کیونکہ صورت میں بہت چیزیں متشابہ ہیں جو واقع میں اضداد ہیں(۲)۔

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کاردیں(۳)

گناہوں کی تقسیم و کیفیت

یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ معاصی پر گرانی ہونا ضروری ہے لیکن حدود وقیود کی رعایت سے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اہلِ حق نے اعمال کو عقائد پر اکتفاء کرکے اتنا ترک کردیا ہے کہ کسی کے ترک اعمال سے گرانی بھی نہیں ہوتی۔ اور جو مبتلا ہے وہ تو کیوں گراں سمجھتا۔ بس یہ حالت ہے کہ جو جس میں مبتلا ہے۔ اُسے گراں نہیں سمجھا بے نمازی نماز پڑھنے کو گراں نہیں سمجھتا اور جو نمازی ہے مگر دوسری آفتوں میں مبتلا ہے وہ انہیں گراں نہیں سمجھتا۔ مثلاً امارد ونساء(۴) پر نظر کیا کرتا ہے اور اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ اور یہ گناہ گو ہے تو صغیرہ مگر بعض اوقات صغیرہ میں اتنے مفاسد ہوتے ہیں کہ وہ ان مفاسد میں کبیرہ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ گناہ میں دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک امتداد(۵) اور ایک اشتداد(۶) سو کبیرہ میں جو سختی ہے وہ اشتداد کی وجہ(۷) سے ہے اور جس گناہ میں اشتداد کم ہے وہ صغیرہ ہے(۸)۔ مگر گناہ میں ایک درجہ ہے امتداد(۹) کا۔ اور یہ اکثر صغیرہ ہی

(۱) ''ساتھی ضرور چاہیئے تنہا راستہ مت چل خصوصاً اس طریق میں بلا رہبر کے قدم مت رکھ'' (۲) ایک دوسرے کی ضد (۳) ''کبھی یہ دکھلاتے ہیں کبھی اس کی ضد سوائے حیرانی کے کاردین میں نہیں ہے'' (۴) مثلاً عورتوں اور نابالغ بچوں کو شہوت کی نظر سے گھورتا ہے (۵) کافی مدت تک اس میں مبتلا رہنا (۶) گناہ کا شدید ہونا (۷) گناہ کبیرہ میں سخت سزا اس کی شدت کی بنا پر ہے (۸) چھوٹا ہے (۹) تسلسل کا ہے۔

میں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اشتداد کا تدارک اکثر اس لئے آسان ہے کہ اس کا معصیت ہونا بین ہے[۱] اس لئے ڈر کر ایک مرتبہ دل سے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ مجھ کو بخشدے) کہہ لیا گویا پہاڑ کو بارود سے توڑ دیا۔ لیکن امتداد کا تدارک اس لئے مشکل ہے کہ اس کو سرسری[۲] سمجھ کر کرتا رہتا ہے اور اس عادت کے سبب اس کا اثر راسخ[۳] ہوتا رہتا ہے پھر توبہ کا عزم سست[۴] ہوجاتا ہے، مثلاً بدنگاہی ہی کو لیجئے کہ اس میں گو اشتداد نہیں مگر امتداد کبیرہ[۵] سے بڑھ کر ہے سرسری سمجھنے سے بھی اور خود کی خصوصیت سے بھی۔

بدنگاہی کا اثر

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ نماز نہ پڑھنے سے کوئی ایسا اثر قلب میں نہیں ہوتا جس سے نجات نہ ہوسکے مگر نگاہ بد کے اثر سے بعض اوقات عمر بھر بھی نجات مشکل ہوجاتی ہے اس کی تو وہ شان ہوجاتی ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ[۶]

چنانچہ ہزاروں قصے ہیں کہ بس ایک دفعہ نگاہ پڑگئی اور عمر بھر کو بے چینی لگ گئی کیونکہ محبوب کے نہ محلّہ کی خبر نہ کچھ پتہ۔ اب فکر ہے کہ دوبارہ کہیں دیکھ لیں اب گھل رہے ہیں۔ یا مثلاً پردہ دار ہے اور وہ فوراً چھپ گئی تو اُسے پھر کیونکر دیکھیں۔ اب اس نے اس پر ایک اور غضب یہ کیا کہ اس خیال کو اپنے دل میں پالا اُسے جمایا کہ بت پرست کی طرح سوچتا رہا کہ ہائے اس کا ایسا رخسارہ ہے اور ایسی ادا اور ایسی زلف۔ جب وہ اچھی طرح دل میں جم گیا تو پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ ملامت نافع ہے نہ خوف نہ حیا نہ شرم۔ کما قیل ؎

(۱) واضح (۲) ہلکا (۳) دل میں جم جاتا ہے (۴) توبہ کا ارادہ (۵) اس میں اگرچہ شدت نہیں ہے لیکن تسلسل کبیرہ سے زیادہ ہے (۶) ''تونے میرے سینہ کے اندر زخم بے نشان کیا ہے حیرت میں ہوں کہ عجیب تیر کمان سے مارا ہے''۔

عَـذْلُ الْـعَـوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِیُ التَّائِہٖ وَھَـوَی الْاَحِبَّۃِ مِنْہُ فی سُوْدَائِہٖ (۱)

اب مرض بڑھا کہ نہ نماز میں جی لگتا ہے نہ روزہ میں۔ نہ اللہ یاد رہا نہ رسول بس ہر وقت وہی مردار ہے حتیٰ کہ اب نماز روزہ بھی ترک ہونے لگا۔اعمال پر اثر پڑا پھر صحت پر اثر پڑا اور بیمار پڑ گیا اور بیماری بھی اتنی بڑھی کہ حالت مایوسی کی ہوگئی۔ غرض ایمان اور جان سب اسی کی نذر ہوگیا یہ سب خرابی اسی نگاہ بد منحوس کی بدولت ہوئی مگر اس میں اسے وہ لذت ہے کہ ترک کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا(۲)، جیسے خارش والے کو کھجلانے سے خارش بڑھتی ہے مگر اس میں وہ مزہ ہے جیسے شاعر نے کہا ہے ؎

لڈو میں نہ برفی میں نہ پیڑے میں مزہ ہے جو حضرت کھجلی کے کھجانے میں مزہ ہے

مگر کسی مبتلا کو اب بھی مایوس نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ مرض بھی گو سخت ہے مگر لاعلاج نہیں مَـا جَـعَـلَ الـلّٰہُ دَاءً اِلَّا وَقَدْ جَعَلَ لَہٗ دُوَاءً خدا نے کوئی مرض ایسا نہیں بنایا جس کا علاج نہ ہو۔ چنانچہ اس عشق مجازی کی بھی دوا ہے اگر کوئی کرنا ہی نہ چاہے تو اور بات ہے۔

مجنوں کا حال

جیسے مجنوں کہ وہ اپنی محبت کو خود زائل کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس کے باپ نے اس سے کہا کہ خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کرو۔ اَلـلّٰھُـمَّ اَزِلْ عَـنِّیْ حُبَّ لَیُـلٰی (اے اللہ مجھ سے لیلیٰ کی محبت دور کردے) تو آپ فرماتے ہیں: الـلھـم زدنی حبّ لیلٰی (اے اللہ مجھ میں لیلیٰ کی محبت بڑھادے) اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

اِلٰھِیْ تُبْتُ مِـن کُـلِّ الْـمَعَاصِیْ وَلٰـکِـنْ حُـبَّ لَیْـلٰے لَا اَتُوْبُ (۳)

(۱) ’’ملامت کرنے والوں کی ملامت قلب کے ارد گرد ہے دوستوں کی محبت سودائے قلب میں یعنی دل کے اندر ہے‘‘ (۲) اتنا مزہ ہے کہ دل چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا (۳) ’’یعنی اے اللہ میں سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں مگر لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا‘‘۔

گو وہ فاسق نہ تھا پاک عاشق تھا اور اپنے عشق میں اتنا کامل ہوگیا تھا کہ اُسے بجائے محبوب کے خود محبت ہی مقصود ہوگئی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ لیلیٰ خود اس کے پاس پہنچ گئی تھی پوچھا مَنْ اَنْت تو کون۔ اس نے کہا اَنَا لَیْلٰی۔ میں لیلیٰ ہوں۔ کہا اِلَیْکَ عَنِّیْ فَاِنَّ حُبَّکَ شَغَلَنِیْ مِنْکَ ہٹ مجھے تیری محبت نے تجھ سے بے نیاز کر دیا تو یہ عشق تھا۔ اور اب تو سراسر فسق ہوتا ہے ؎

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود ایں فساد خوردن گندم بود(۱)

سو مجنوں نے علاج نہ چاہا مبتلائے معصیت رہا لیکن وہ فاسق نہ تھا اس لئے علاج نہ کرنا صرف اس کی جان ہی تک مضر رہا۔

عشق مجازی کا نقصان

اور اب تو فسق کے سبب ایمان کی بھی خیر نہیں اس لئے علاج کی سخت ضرورت ہے ورنہ یاد رکھو کہ اگر یہ عشق ختم نہ ہوا تو عجب نہیں اعمال و ایمان ہی ختم ہوجائیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک بوڑھے آدمی تھے وہ ایک یہودن پر عاشق ہوئے۔ میں ان کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کا ادب باپ کا سا کرتا تھا اور وہ طالب علم سمجھ کر میرا ادب کرتے تھے مگر اس حیا سوز عشق میں یہاں تک نوبت پہونچی کہ وہ سب ادب وحیا کو بالائے طاق رکھ کر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں۔ اگر وہ عیسائی ہے تو میں عیسائی ہوں۔ نعوذ باللہ وہ تھے تہجد گذار مگر دیکھئے ایک بدنگاہی سے سب ختم ہوگیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس سے بہت بچنا چاہیئے۔

عاشقوں کا انجام بد

ابن القیم نے دواء الکافی میں ایک حکایت لکھی ہے ایک نہایت حسین عورت

(۱) ”یہ عشق جو عام لوگوں میں ہوتا ہے یہ عشق نہیں ہے بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے“۔

نے ایک آدمی سے حمام منجانب کا راستہ پوچھا کچھ نظر اور کچھ اس کی باتوں سے اور کچھ اس کی صورت سے یہ گرویدہ ہوگیا۔ اور اسے دھوکہ دیا کہ اپنے ہی مکان کو حمام منجانب بتادیا۔ جب وہ مکان میں گئی یہ بھی اندر گھس گیا۔ وہ تھی عفیفہ(۱) اس کی بدنیتی کو سمجھ گئی۔ اس نے کہا کہ میں تو خود تجھ پر فریفتہ ہوں(۲) مگر اس وقت میں بہت بھوکی ہوں۔ پہلے میرے لئے کچھ کھانے کو لاؤ۔ آپ بازار میں گئے۔ جب اس نے گھر اکیلا پایا تو چپکے نکل کر چلدی۔ اب جو کھانا لے کر آیا اور اسے نہ پایا تو مارے غم کے بیمار پڑ گیا اور یہاں تک کہ وقت اخیر آ گیا لوگوں نے کہا لا الٰـــہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو تو یہ بجائے اس کے یہ کہتا ہے ۔

یَـا رَبِّ سَـائِـلَـةٌ یَـوْمًـا وَقَدْ تَعِبَتْ اِیْنَ الطَّرِیْقُ اِلٰی حَمَّامِ مِنْجَانِبُ (۳)

اور اسی پر خاتمہ ہوگیا۔ انہوں نے ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک لڑکے پر عاشق تھا اس کے فراق میں بیمار ہوگیا۔ کسی نے اس لڑکے کو سمجھایا کہ تمہارے سامنے چلے جانے سے اُسے افاقہ ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہوگیا۔ اس کو بھی کسی نے خبر دیدی کہ وہ لڑکا آرہا ہے یہ مارے خوشی کے اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہ راستہ ہی سے لوٹ گیا کہ جانے میں رسوائی ہے اس کی بھی اُسے کسی نے خبر دیدی وہ پھر گر پڑا اور یہ شعر پڑھنے لگا ۔

رَضَـــاکَ اَشْھٰــی اِلٰـی فُـوَادِیْ مِـنْ رَحْـمَـةِ الْـخَالِقِ الْجَلِیْلِ (۴)

بس اسی پر دم نکل گیا۔ ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص شہوات ومعاصی(۵) میں منہمک تھا اس سے اخیر وقت میں کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو کہتا ہے

(۱) پاک دامن (۲) عاشق ہوں (۳) شہوت پرستی اور گناہوں میں (۳) ''اے رب حمام منجانب کے راستہ کو پوچھنے والی کہاں ہے'' (۴) ''تیری خوشنودی میرے دل کی زیادہ خواہش مند ہے خالق جلیل کی رحمت سے'' (۵) شہوت پرستی اور گناہوں میں۔

کہ اتنے معاصی (۱) کے ہوتے ہوئے کلمہ ہی سے کیا ہوگا اور اسی پر دم نکل گیا۔ کمبخت معاصی میں بھی خاصیت ہے کہ رحمت خداوندی سے مایوس کر دیتی ہے (۲)۔ تب ہی تو کلمہ سے انکار کیا اور اس کو بیکار سمجھا۔ اسی کے مناسب ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے یہاں قریب کے ایک قصبہ میں ایک خون ہوگیا تھا۔ اس میں دو آدمی ماخوذ ہوئے اور دونوں کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔ حکم کے بعد پوچھا گیا تم کچھ چاہتے ہو تو ایک نے تو کہا کہ میرے بھائی کو بلا دو اور مجھے غسل و نماز کی اجازت دو۔ چنانچہ اجازت ہوگئی اس نے اپنے بھائی کو چند وصیتیں کیں اور کہا کہ میاں آج میرا وقت پورا ہو چکا تھا اگر پھانسی نہ ہوتی تو میں اور کسی طرح مرتا۔ پھر اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور کلمہ پڑھ کے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اور دوسرے نے اپنے عزیزوں سے اس قسم کی خرافات وصیتیں کیں کہ مثلاً میرا پیسہ کبھی کسی مسجد میں لگنے نہ پائے اس سے کہا گیا کہ کلمہ پڑھ تو کہتا ہے عمر بھر پڑھا تو کیا ہوا اور اب پڑھوں گا تو کیا ہوگا، اسی کے بعد پھانسی ہوگئی نعوذ باللہ۔

عشق نفسانی کی بڑی آفت

تو بہر حال بڑی ضرورت ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی جن میں آثار ہوں اور سب ہی معاصی ایسے ہیں خصوصاً یہ عشق نفسانی اور اس میں ایک اور بڑی آفت ہے وہ یہ کہ اگر کسی نے جوانی میں احتیاط اور توبہ نہ کی ہو تو یہ مرض بڑھاپے میں اور بڑھ جاتا ہے۔ اس پر ایک تفریع فقہی کرتا (۳) ہوں وہ یہ کہ بوڑھے آدمی سے اپنے سیانے لڑکے اور سیانی لڑکی کو زیادہ بچانا چاہیئے۔ وجہ یہ کہ جوانی میں اگر شہوت

---

(۱) اتنے گناہوں کی موجودگی میں (۲) گناہوں کی خاصیت ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیتے ہیں
(۳) اس سے ایک فقہی مسئلہ نکالتا ہوں۔

زیادہ ہوتی ہے تو قوت ضبط بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس قوت ضبط ہی سے قوت شہوت میں لذت ہوتی ہے۔ تو اگر کوئی خوف حق سے ابھی ضبط نہ کرے گا تو لذت ہی کے لئے ضبط کرے گا۔ اور یہ لذت معین ہوجاوے گی مداومت ضبط (۱) پر اور اس سے رفتہ رفتہ وہ اس ضبط میں خوف حق کی نیت کرکے متقی بن جائے گا اور بوڑھے میں گو قوت شہوت کم ہے (۲) مگر قوت ضبط بھی کم ہے (۳)۔ کیونکہ شہوت اور ضبط کا دارومدار حرارت عزیزیہ پر ہے اور وہ بڑھاپے میں کم ہوجاتی ہے اس لئے اس میں ضبط کم ہوگا۔ پس وہ زیادہ احتیاط کے قابل ہے گو وہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو پیروں سے تو بالکل پردہ نہیں کراتے پیر خواہ جوان ہوں یا بوڑھے عورتیں ان کے ہاتھ پیر دباتی ہیں۔ اے اللہ کہاں گئی شریعت اور کہاں گئی شرم وغیرت۔ ہم نے مانا کہ پیر صاحب ایسے پیر اور ایسے متقی ہیں کہ ان سے خطرہ نہیں ہے مگر دوسروں کو اپنی بے حیائی کے لئے سند تو ہوجاوے گی۔

بدنظری کے علاج کی ضرورت

بہرحال یہ مرض نظر بد عشق نفسانی سخت مرض ہے مگر علاج اس کا بھی ہے البتہ ذرا دوائے تلخ ہے (۴) مگر اس تلخی کے ساتھ اس میں دین کی لذت بھی ہے سو اس کی لذت کے لئے تلخی (۵) کو تو گوارا کرلو۔ شاید کوئی کہے کہ تلخی میں لذت کہاں میں کہتا ہوں کہ کیا تم مرچ نہیں کھاتے کہ منہ سے بھی نہر جاری ہے اور ناک سے بھی اور آنکھ سے بھی مگر چھوڑتے نہیں (۶) تو دیکھئے تلخ ہے اور مزہ دار (۷)۔ کسی کو

(۱) یہ لذت مسلسل ضبط کرنے کے لئے معاون ثابت ہوگی (۲) شہوانی قوت کم ہے (۳) قوت ضبط بھی کم ہے (۴) اسکی دوا ذرا کڑوی ہے (۵) کڑواہٹ (۶) آنکھ ناک منہ سے پانی نکل رہا ہے (۷) کڑواہٹ کے باوجود مزیدار ہے۔

مرچ کی عادت نہ ہو تو تمباکو لے لیجئے اس میں جتنی زیادہ تلخی ہو اتنا ہی زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ میں نے کبھی پیا نہیں مگر کھانے والے پینے والوں کے قصے سنے ہیں اس لئے تقلیداً کہتا ہوں۔ ہائے افسوس لذت کے سبب مرچوں کی تلخی مطلوب اور تمباکو کی تلخی مطلوب مگر دین کی لذت کے لئے علاج کی تکلیف سے نفرت۔ کیا دین کی تمباکو اور مرچوں کے برابر بھی وقعت نہیں۔

عشق نفسانی کا علاج

اب وہ علاج بتلاتا ہوں جس سے اس مرض عشق نفسانی سے شفا ہو جائے اور وہ علاج صرف یہ ہے کہ اس کی طرف بالکل توجہ نہ کرے، اور توجہ کی بھی قسمیں ہیں۔ توجہ بالقلب۔ توجہ باللسان۔ توجہ بالبصر۔ توجہ بالید(۱)۔ توجہ بالرجل۔ تو ان سب کو ترک کرے یعنی نہ تو اس کا تصور کرے نہ تذکرہ کرے نہ اس کی طرف دیکھے نہ اسے ہاتھ سے چھوئے نہ پیروں سے چل کے اس تک جائے۔ خلاصہ یہ کہ جتنا اس سے بعد ہوگا اتنا ہی نفع ہوگا۔

اس میں مجھ کو ایک احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید کوئی یہ علاج شروع کر کے اگلے ہی دن کہنے بیٹھ جائے کہ علاج تو کیا مگر اب تک وہی حال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا تو امراض حسیہ میں بھی بہت ہوتا ہے کہ ایک مسہل میں درد نہیں جاتا(۲) بلکہ بعض دفعہ اکیس اکیس مسہل ہوتے ہیں تب کہیں مادہ خارج ہوتا ہے کوئی علاج نہیں چھوڑ دیتا تو اس میں بھی جلدی نہ کرو علاج کرتے رہو ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور نفع ہوگا۔

(۱) دل کی توجہ، زبان کی توجہ، آنکھ کی توجہ، ہاتھ کی توجہ (۲) جسمانی امراض میں بھی ہوتا ہے کہ ایک دفعہ دست آور دوا کھانے سے درد ختم نہیں ہوتا۔

دل کی توجہ کا علاج

ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ اور سب باتیں تو آسان ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں، زبان، آنکھ سب قابو میں ہیں مگر دل کو کیا کریں کہ خیال آتا ہی ہے میں کہتا ہوں اَلنَّفُسُ لَا تَتَوَجُّهُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) یہ قضیہً لازمہ عادیہ ہے[1]۔ اب تم یہ کرو کہ کسی دوسری شئے کا تصور کیا کرو اور اس کی طرف قصداً توجہ نہ کرو۔ قصداً دوسری طرف توجہ رکھو۔ اس سے وہ آپ دفع ہو جاوے گا۔ بلکہ یہ بھی نہ کرو کہ اس کو قصداً دفع کرو[2] کیونکہ اس سے تو پھر ادھر توجہ ہوگئی۔ غرض رفع کے قصد سے بھی ادھر متوجہ نہ ہو اس کی مثال تار بجلی جیسی ہے کہ اگر ہٹانے کے لئے لگا دیا جب بھی لپٹے گا اور کھینچنے کے لئے لگایا تب بھی لپٹے گا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہاتھ ہی مت لگاؤ نہ ہٹانے کے قصد سے نہ لانے کے قصد سے۔

وساوس کا علاج

اور یہی علاج ہے بعینہ وساوس کا کہ ادھر توجہ نہ کی جاوے اس سے خود دفع ہو جاویں گے۔ اس میں بھی بعضے ایسے ہی غلطی کرتے ہیں کہ قصداً انہیں ہٹاتے ہیں حالانکہ اس کا یہ علاج نہیں یہ لوگ علاج ہی میں غلطی کرتے ہیں۔ بقول مولانا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند　　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حال دروں　　　استعیذ اللہ مما یفترون[3]

مولانا نے یہاں ایک حکیم کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے ایک مریض کو

---

(۱) عادۃً ایسا ہی ہوتا ہے (۲) ارادۃً اس کو دور بھی نہ کرو (۳) ''اس نے کہا انہوں نے جو کچھ علاج و معالجہ کیا سب بیکار ثابت ہوا اندرونی حال سے وہ بے خبر تھے اللہ سے اس بات کی پناہ جس کو وہ اظہار افترا کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ مرض کچھ تھا اور بتلا دیا کچھ''۔

دیکھ کر کہا تھا کہ جتنا لوگوں نے علاج کیا ہے سب الٹا ہی کیا اسی طرح غیر محقق کے علاج کو محقق کہتا ہے۔ تصوف واقعی حکمت ہے۔ اس میں بڑے ماہر محقق کی ضرورت ہے۔ پس وسوسہ کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کو قصداً دفع نہ کرو بلکہ دوسری طرف توجہ کرلو۔

اشکال کا جواب

اب ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ ہم نے یہ بھی کر کے دیکھا ہے کہ جب وساوس آتے ہیں تو الفاظ قرآنیہ کی طرف توجہ منصرف کردیتے ہیں (۱) مگر اس وقت بھی سامنے وساوس ہوتے ہیں اس کے جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اول ایک مثال سمجھئے اور وہ بھی مسئلہ فلسفہ ہی کا ہے وہ یہ کہ علم مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ کسی چیز کے نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے شعائیں نکل کر مرئی کو محیط ہوجاتی ہیں (۲) مگر جو چیزیں مرئی کے گردوپیش ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ نظر آتی رہتی ہیں (۳)۔ مثلاً ایک نقطہ ہے آپ ٹکٹکی باندھ کر اسی کو دیکھ رہے ہیں مگر اس کے آس پاس کے دوسرے نقطے بھی بلاقصد نظر آتے ہیں اگر کوئی استاد حکم دے کہ اور نقطہ کو مت دیکھو تو مطلب یہ ہے کہ بالقصد مت (۴) دیکھو کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اسی طرح نفس کی حالت ہے کہ جب قصداً تم مثلاً الفاظ قرآنیہ کو ذہن سے دیکھ رہے ہو تو علاج پر عمل ہوگیا۔ گو اور چیزیں جو متخیلہ میں جمع ہیں (۵) وہ بھی ذہن کے سامنے آجاویں پس ان کا خیال آنا منع نہیں ہے ہاں لانا منع ہے (۶)۔ اب اس پر کوئی کہے کہ جب وساوس آگئے خواہ لانے سے یا بے لائے تو پھر علاج کا فائدہ کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ چند روز تک تو وہ آتے ہیں اور اس کے بعد پھر خود بخود غائب ہوجاتے ہیں اور یہی فرق ہے

(۱) توجہ پھیر دیتے ہیں (۲) آنکھ کی شعائیں دکھائی دینے والی چیز کو گھیر لیتی ہیں (۳) جس چیز کو دیکھ رہا ہے اس کے اردگرد کی چیزیں بھی تھوڑی بہت نظر آتی ہے (۴) ارادۃً (۵) جو تمہارے خیالات میں جمع ہیں (۶) اس خیال کا آنا منع نہیں ہے ہاں خود سے اس کا خیال کرنا منع ہے۔

بصیرت و بصارت میں (۱) کہ بصر سے تو وہ گردوپیش کی چیزیں غائب نہیں ہوتیں مگر بصیرت سے غائب ہوجاتی ہیں پھر اس وقت یہ حالت نصیب ہوجاتی ہے ؎

دل آرامے کہ داری دل دروبند   وگر چشم از ہمہ عالم فروبند (۲)

اسی طرح تم وساوس کے ہجوم کے وقت کسی دوسری چیز کی طرف توجہ منعطف (۳) کرلیا کرو چاہے وہ دوسری چیز کلام ہو چاہے ڈھیلا مٹی اور چاہے تصور شیخ ہو۔ اس اثر میں سب برابر ہیں۔

تصور شیخ کی حقیقت

اور یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق بھی ہوگئی کہ وہ کوئی مستقل شغل نہیں ہے بلکہ اس کا تصور اس لئے دل میں لاتے ہیں تا کہ خطرات دفع (۴) ہوجاویں اور گو یہ غرض دوسرے تصورات سے بھی حاصل ہوسکتی ہے مگر شیخ محبوب ہے اور محبوب کے تصور کو اس غرض میں زیادہ دخل ہے اس لئے اہلِ طریق نے اس کو اختیار کیا، پھر جب خطرات دفع ہوگئے جس کی ضرورت سے تصور شیخ کیا تھا، اب شیخ کو بھی رخصت کرو اور خالص ذاتِ الٰہی کی طرف توجہ کرو۔ جیسے دولہا اور دلہن کے بیچ میں مشاطہ (۵) اور نائن (۶) ہوتی ہے مگر جب خلوت (۷) کا وقت آتا ہے تو صرف دولہا اور دلہن رہ جاتے ہیں اور نائن باہر کردی جاتی ہے تو تصور شیخ مشاطہ (۸) تھا توجہ بحق کے وقت یہ بھی رخصت (۹) بقول مولانا ؎

جلوہ بیند شاہ وغیر شاہ نیز   وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز (۱۰)

---

(۱) یہی فرق ہے دل کی آنکھ اور جسم کی آنکھ میں (۲) ''جب محبوب سے تم نے دل لگالیا ہے تو پھر تمام جہاں سے آنکھیں بند کرلو'' (۳) توجہ پھیرلو (۴) وسوسے دور ہوجائیں (۵) میکپ کرنے والی عورت (۶) نائی کی بیوی۔ نکاح وغیرہ کے معاملات طے کرنے کے لئے نائی اور اس کی بیوی کو مقرر کیا جاتا تھا (۷) تنہائی کے وقت (۸) شیخ کا تصور بناؤ سنگھار کرنے والے کی طرح تھا (۹) اللہ کی طرف توجہ کے وقت یہ بھی غائب ہوجائے گا (۱۰) جلوہ دیکھتا ہے بادشاہ اور غیر بادشاہ بھی خلوت کے وقت بادشاہ کے سوا کوئی عزیز۔

اور یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ پیر کا حق اس کو رہبر بنانا ہے پرستش نہیں کیونکہ معبود کبھی علیحدہ نہیں کیا جاتا۔

عشق نفسانی کا علاج تدریجاً ہوتا ہے

اسی طرح عشقِ نفسانی میں جب محبوب کا خیال بلا قصد آئے تو اس وقت دوسرے کسی مباح التصور امر کا تصور (۱) کرلے تو اس سے محبوب مجازی کی صورت آہستہ آہستہ اکھڑ کر جاتی رہتی ہے اور یہ امر بھی قابل تنبیہ ہے کہ جاتے رہنے کی بھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اول بتدریج میلان میں کمی ہوگی پھر چند روز کے بعد میلان بالکل نہیں رہے گا۔ مگر اس کے بعد کچھ کچھ محبت معلوم ہوا کرے گی مگر ادنیٰ اہتمام سے وہ مضمحل ہوجاوے گی۔ اس میں بھی بعضوں کو غلطی ہوتی ہے کہ جب دوبارہ پھر میلان ہوا تو وہ سمجھا کہ میرا مرض پھر عود کر آیا۔ مگر نہیں وہ مطمئن رہے کہ مرض نے عود نہیں کیا ورنہ ادنیٰ اہتمام سے دفع نہ ہوتا ازالہ رذائل (۲) کے معنی یہی ہیں کہ غلبہ جاتا رہے۔

اخلاق رذیلہ کے وجود کی حکمت

باقی جڑ باقی رہتی ہے اور اس قدر اصل کا باقی رہنا بھی حکمت الٰہیہ ہے۔ کیونکہ اگر رذائل کی اصل ہی نہ رہے تو پھر مقاومت (۳) کا اجر کیسے ملے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است — کہ از وحمام تقویٰ روشن است (۴)

گوبر کے اُپلے (۵) اور کنڈے (۶) نجس تو ہیں مگر یہ نہ ہو تو حمام (۷) کا پانی گرم نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح تقوی کا نور بھی شہوت ہی سے ہے بشرطیکہ اس کو

---

(۱) کسی ایسی چیز کا تصور کرلے جس کا تصور کرنا جائز ہو (۲) رذائل کو دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا غلبہ ختم ہوجائے (۳) اس سے مقابلے کا ثواب کیسے ملے گا (۴) ''دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے'' (۵) جلانے کے لئے گوبر کے سکھائے ہوئے ٹکڑے (۶) یہ ٹکڑے ناپاک تو ہیں (۷) پانی گرم کرنے کی ٹنکی۔

جلاتے رہو جمع کر کے دل میں نہ رکھو۔ الحمدللہ ہر پہلو سے یہ مسئلہ صاف ہوگیا۔ اور عشق نفسانی کا علاج معلوم ہوگیا۔ یعنی اس طرح التفات نہ کرو اس سے محبت مغلوب ہو جاوے گی۔

میلان نفس

اور مطلق میلان نہ ہونا مطلوب نہیں اگر اتنا میلان بھی نہ ہو تو بے حسی ہے جیسے گلاب میں سے کسی کو خوشبو کے بجائے بدبو آنے لگے تو معلوم ہوا۔ اس کی قوت شامہ (۱) خراب ہوگئی ہے کیونکہ اچھی چیز تو اچھی ہی لگنی چاہئے۔ اگر ایسا ہو تو یہ شخص سلیم الحواس (۲) نہیں۔ پس میلان سے تو نہ گھبراؤ۔ ہاں اس کے مقتضا پر عمل نہ کرو۔ یعنی میلان کے بعد اس کو دیکھنے میں مشغول نہ ہو کہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھ کر قصداً دوسری طرف مشغول ہونا بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ اگر خود غیرت نہیں رہی تو غیرت حق کو سوچو اور دیکھو کہ اگر کسی کو بادشاہ کا قرب میسر ہو جاوے اور اس کو محل میں جانے کی اجازت ہو جاوے اور وہ وہاں جا کے لونڈیوں کو دیکھنے لگے تو بادشاہ کیا کہے گا۔ اسی طرح خدا کی بھی غیرت آتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگ فواحش میں مبتلا ہوں۔ حقیقت میں خدا کے ہوتے ہوئے کسی اور پر نظر کرنا بڑی سخت بات ہے۔

عاشق نفس پرست کا علاج

اختتام مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک خوبصورت عورت جا رہی تھی ایک شخص اس کے پیچھے ہولیا وہ سمجھ گئی۔ اس نے کہا کہ مجھے کیا دیکھتا ہے میرے پیچھے میری دوسری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے بہت زیادہ حسین ہے۔ یہ اس کے دیکھنے کے لئے پلٹا۔ اس نے ایک دھول رسید کیا (۳) اور کہا کہ ؎

(۱) سونگنے کی قوت (۲) اس کے حواس درست نہیں (۳) ایک جوتا مارا۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی در بیان دعوئے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر(۱)

جب اس عورت کو غیر پر نظر کرنے سے اتنا غیظ(۲) ہوا تو کیا حق تعالیٰ کو غیظ نہ ہوگا۔ غرض یہ مرض بڑا شدید ہے(۳) ابتداء میں تو صغیرہ ہے مگر اثر میں اور انتہا میں شدید و مدید ہے(۴)۔

غلو فی الدین

اصل میں یہ گفتگو اس پر تھی کہ ایک شخص بے نمازی کو تو بُرا سمجھتا ہے مگر اپنی بدنگاہی سے نفرت نہیں کرتا جس کے اتنا مفاسد ہیں۔ تو بعضے ایسے لوگ جن کے عقائد تو درست ہیں اور یہ غلطی بکثرت اہل علم کو یا ان کی صحبت والوں کو ہوتی ہے یعنی اگر وہ کسی کی نسبت مثلاً یہ سن لیں کہ یہ شخص بدعات سے مجتنب ہے(۵) گو اس کے تمام اعمال تباہ ہوں۔ بس پھر اُسے اس اہلِ بدعت پر بھی ترجیح دینے لگتے ہیں۔ جہاں منشا بدعت کا محض خطائے اجتہادی ہی(۶) ہو یہ غلو فی الدین(۷) نہیں تو کیا ہے۔ انہوں نے عبادت کے درجات کو چھوڑ کر عقائد کو اساس قرار دے کر فروع کو بے وقعت سمجھ لیا ہے(۸) جیسے کوئی درختوں کی شاخیں کاٹ دیا کرے اور صرف تنہ دیکھ کر خوش ہوا کرے کہ باغ لگا ہوا ہے حالانکہ اس باغ دین کی تو یہ شان ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر زباغِ دل خلالے کم بود(۹)

کہاں تو یہ حالت کہ ایک تنکا بھی کم ہونا گوارا نہیں اور کہاں یہ کہ تمام

---

(۱) ''اس نے کہا اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعوے کے بیان میں سچا ہے تو پھر تو نے غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی بے غیرت کیا یہی عشق کا دعویٰ تھا'' (۲) غصہ آیا (۳) بہت سخت ہے (۴) یہ مرض ابتداء میں تو چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن انتہاء میں بہت سخت اور طویل مدت تک رہتا ہے (۵) ارتکاب بدعات سے بچنے والا (۶) اس بدعت میں ابتلاء اجتہادی غلطی کی بنا پر ہو (۷) دینداری میں حد سے تجاوز (۸) عقائد کو بنیاد قرار دے کر فروع مسائل پر عمل کو حقیر سمجھا (۹) ''عارف کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے''

شاخیں کاٹ کے بھی خوش ہیں کہ جڑیں تو ہیں۔

صرف عقائد کی درستی کرنے والوں کی مثال

ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بنیاد بھر کر خوش ہو کہ میں نے مکان بنالیا ہے۔ اگر کسی نے بنیادیں بھر دیں اور مکان بنایا نہیں تو برسات آنے دو۔ اب پانی برسا تو کپڑے بہے بہے پھرتے ہیں سب سامان بھیگ رہا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو بنیاد کو کافی سمجھا۔ کام تو دیواروں اور چھت سے پڑے گا گو بقاء(۱) ان کا بیشک بنیاد سے ہے۔ میں نے بڑی نادانی(۲) کی کہ پہلے ہی بنیاد کے ساتھ دیواریں نہ بنالیں ہاں البتہ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا جس کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں اس کی عمارت جب بنے گی جلدی تیار ہوگی۔ اور مضبوط بنے گی اور جس کی جڑ ہی کھوکھلی ہوگی اس کو مشکل ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اہم الاجزاء عقائد(۳) بیشک ہیں مگر ان کے بعد دوسرا درجہ اعمال کا بھی تو آخر کچھ ہے۔

عقائد کے درست نہ کرنے کی غلطی

ایک غلطی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ تصحیح عقائد کو ضروری نہیں سمجھتے تسبیح، نماز، روزہ تو کرتے ہیں مگر عقائد کی تصحیح کی فکر نہیں کرتے اور اکثر اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ قصور ان کا ہے جو بیعت کر کے کچھ وظائف بتلا کے خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی فکر ہی نہیں کہ عقائد اس شخص کے کیسے ہیں جن کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک درویش صاحب نے مجھ سے پوچھا تصور شیخ جائز ہے یا ناجائز۔ میں نے کہا پہلے آپ اس کے معنی بتائیے تو کہتے کیا ہیں کہ خدا کو

(۱) اگرچہ دیواریں اور چھت بنیادوں کے بعد ہی پڑتی ہیں (۲) ناسمجھی (۳) درستی کے لئے سب سے اہم جز بیشک عقیدہ ہی ہے۔

پیر کی شکل میں سمجھنا۔ نعوذ باللہ [۱]۔ وہ تو حضرت پابند صوم صلوٰۃ بھی تھے اور تہجد وذکر والے بھی تھے اور عقیدہ یہ۔ اور پھر مزید یہ کہ اس بدعقیدگی کو مضر [۲] نہیں سمجھتے۔

وساوس کی حقیقت اور اس کا علاج

ایک شخص نے مجھے خط لکھا کہ جب نماز تنہا پڑھتا ہوں تو وساوس نہیں آتے۔ اور جماعت سے پڑھتا ہوں تو وساوس بہت آتے ہیں تو جی چاہتا ہے جماعت چھوڑ دوں۔ تو یہ بزرگ خلاف سنت کو سنت سے افضل سمجھ رہے تھے۔ درحقیقت یہ طریق بہت نازک ہے۔ عارف شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است　　　ہشدار گوش رابہ پیام سروش دار [۳]

یعنی ہر قدم پر وسوسہ ہے شیطان کا، بس وحی کا اتباع کرو دیکھئے کتنے بڑے دھوکے میں مبتلا کیا شیطان نے کہ حضور قلب نماز کی روح ہے اور ہر شے میں مقصود روح ہوتی ہے تو نماز میں بھی زیادہ مقصود حضور قلب ہی ہے اس کے بعد دیکھا کہ جماعت میں یہ روح ملتی نہیں اور قاعدہ ہے کہ اَلشَّیُٔ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَۃٍ اِنْتَفٰی ۔ یعنی جو شے مقصود سے خالی ہوگی وہ منتفی ہوجائے گی۔ بس یہ نتیجہ نکال کے گمراہ ہوا کہ جماعت ہی سے نماز نہ پڑھے۔ اس کا جواب قاطع بحث تو یہ ہے کہ ترکِ جماعت جب شریعت کے خلاف ہو تو اس میں ہزار مصالح ہوں سب لغو ہیں یہ تو سنار کی سوکھٹ کھٹ کے مقابلہ میں لوہار کی ایک ہے۔ خیر میں کھٹ کھٹ کا ہی جواب دیتا ہوں کہ حقیقت میں یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے [۴]۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ حضور قلب کے یہی معنی ہیں جو سائل نے سمجھے۔ یعنی وساوس کا نہ آنا

(۱) اللہ کی پناہ (۲) اس غلط عقیدہ کو نقصان دہ نہیں سمجھتے (۳) ''راہِ سلوک میں شیطان کے وساوس بہت ہوتے ہیں ہوشیار رہو اور وحی کی طرف کان لگائے رہو'' (۴) غلط بات پر کسی غلط بات کو موقوف کرنا ہے۔

لفظ حضور قلب تو ایک تعبیر ہے اور حقیقت اس کی احضار القلب ہے (۱) اہل علم تو اتنے ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر سب کے سمجھنے کے لئے تفصیل بھی کئے دیتا ہوں یعنی ایک تو ہے وساوس کی آمد اور ایک ہے آورد (۲)۔ سو آورد مضر ہے آمد مضر نہیں (۳) تو مقصود نماز میں صرف قلب کو اپنے قصد سے حاضر کرنا ہے (۴) پھر خواہ حاضر ہو یا نہ ہو اور یہ احضار خواہ ذکر کی طرف توجہ کرنے سے ہو خواہ مذکور کی طرف (۵) توجہ کرنے سے ہو۔

نماز میں حضور قلب کا طریقہ

یعنی اس کے دو طریقے ہیں۔ مبتدی کے لئے تو یہ ہے کہ ذکر کی طرف توجہ کرے اس کا طریقہ نہایت سہل ہے۔ ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتایا کہ نماز کے ہر جزو کو اپنے قصد سے ادا کرو۔ صرف یاد سے مت پڑھو۔ یعنی اب تو یہ عادت ہے کہ گھڑی کی کوک (۶) کی طرح اللہ اکبر کہہ لیا کہ یہ تو نماز کی کوک ہے اور الحمد اور انا اعطینا اور قل ھو اللہ یہ سب ہی کو ازبر ہے۔ بس شروع سے آخر تک سب خود بخود نکلتا چلا گیا۔ تو ایسا مت کرو بلکہ اللہ اکبر کہو تو سوچ کے اور ارادہ سے کہو کہ میں اللہ اکبر کہہ رہا ہوں۔ اس کے بعد سبحانک اللھم پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ ایک ایک لفظ کو مستقل ارادہ سے کہو پھر اسی طرح الحمد پڑھو۔ پھر اسی طرح سورت ملاؤ۔ غرض ہر ہر لفظ ارادہ سے ادا کرو۔ یہ تو مبتدی کا طریقہ تھا۔ اور منتہی کا یہ ہے کہ بلا واسطہ حضرت حق کی طرف توجہ کو قائم کردے اور یہ حالت جب ہی حاصل ہوگی جبکہ اول مبتدی کی طرح عمل کروگے۔ بس تم اول ذکر پر توجہ کرو پھر شدہ شدہ (۷) مذکور کی طرف توجہ حاصل ہوگی۔

---

(۱) دل کو حاضر کرنا ہے (۲) ایک ہے وساوس کا آنا اور ایک ہے وساوس کا لانا (۳) آنا نقصان دہ نہیں لانا نقصان دہ ہے (۴) اپنے ارادے سے دل کو نماز میں حاضر کرنا ہے (۵) یہ حاضر کرنا چاہے ذکر کی طرف توجہ کرنے سے ہو یا مذکور یعنی اللہ کی طرف (۶) گھڑی کی چابی (۷) پھر آہستہ آہستہ۔

مبتدی اور منتہی کے لئے احضار کا طریقہ

اور اس سے ایک نکتہ اور سمجھ میں آیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلاً۔(۱) ’’اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو‘‘ تو یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ وذکر ربك کیوں نہیں فرمایا اسم کیوں بڑھایا۔ اس کے جواب میں بعض نے کہا ہے کہ اسم زائد ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اسم کو زائد کہنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس میں مبتدی کا درجہ بتایا ہے کہ وہ اسم ہی کی طرف توجہ کرے تو کافی ہے پھر اسی سے مسمیٰ تک پہنچ جاوے اور ’’وتبتل الیه‘‘ میں منتہی کا کیونکہ ابھی بلا واسطہ ذکر رب پر قدرت نہیں اس لئے اس کو ذکر اسم رب کافی ہے(۲) اور منتہی کو اس پر قدرت ہے۔ اس لئے اس کو حضرت حق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ مگر یہ تفسیر نہیں نکتہ ہے لیکن اس پر میرا استدلال موقوف بھی نہیں۔ بہرحال احضار قلب کے دو طریقے ہیں ایک بواسطہ توجہ الی الذکر کے اور ایک بواسطہ توجہ الی المذکور کے(۳) تو روح نماز کی یہ احضار قلب ہے اگر اس احضار کے بعد وسوسے آویں تو یہ حضور قلب کے منافی نہیں ہے تو جماعت کی نماز میں جب احضار کر لیا گو حضور نہ ہو تو یہ کہنا سراسر غلط ہو گیا کہ جماعت میں حضور قلب نہیں ہوتا تو دیکھئے کتنی بڑی دولت سے شیطان نے محروم کرنا چاہا تھا۔ حدیث شریف میں ہے۔ جماعت کی ایک نماز میں پچیس نماز کا ثواب ملتا ہے اس لئے کسی بات میں اپنی رائے پر عمل نہیں کرنا چاہئیے بلکہ شریعت پر چلتے رہو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست   بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست(۴)

---

(۱) المزمل:۸ (۲) اس کو رب کا نام لینا ہی کافی ہے (۳) نماز میں حضور قلب کبھی ذکر کی طرف توجہ کے واسطے سے اور کبھی مذکور کی طرف توجہ کے واسطے سے حاصل ہوگا (۴) ’’شریعت میں جو حالت بھی سالک کو پیش آئے اس کے لئے بہتر ہے اے دل صراط مستقیم پر کوئی شخص گمراہ نہیں ہے‘‘۔

صراط مستقیم سے مراد شریعت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حالت شریعت کے موافق ہو تو پھر جو حالت بھی بلا اختیار پیش آوے جیسے لفظ آید اس پر دال ہے وہ سب خیر ہی ہے خواہ وساوس ہوں یا اس سے بڑھ کر کچھ ہو۔

اسی طرح دعا میں بھی شیطان بہکاتا ہے کہ ہماری دعا ہی کیا جب حضور قلب نہ ہو۔ ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں بہت مقروض ہوگیا ہوں میرے لئے اداء قرض کی دعاء کرو۔ میں نے کہا میں بھی کرتا ہوں تم بھی کرو کہنے لگے اجی ہماری دعا ہی کیا۔ میں نے کہا کلمہ طیبہ جس سے آدمی مسلمان ہوتا ہے افضل ہے یا دعا کہنے لگے کلمہ طیبہ میں نے کہا بس یہی کہہ کے اسے بھی چھوڑ دو کہ ہمارا اسلام ہی کیا۔ میں کہتا ہوں جو کچھ ہے اسی کو غنیمت سمجھو۔ بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے ''مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا'' غرض ایسے ہی جہل سے لوگوں کے عقائد خراب ہورہے ہیں اور جب عقائد خراب ہوئے تو عبادت بھی ناقص ہوگی کیونکہ عبادت کے معنی عبد شدن ہے (۱)۔ اور اس میں عقائد واعمال سب داخل ہیں جب ایک جزو بھی ناقص ہوا تو مجموعہ ضرور ناقص ہوگا۔ یہ پہلی اور دوسری غلطی تو عقائد واعمال کے متعلق تھی۔

معاملات میں کوتاہی

تیسری غلطی یہ ہے کہ بعض نے معاملات کو ضروری نہیں سمجھا چنانچہ اجارات وتجارات (۲) میں بیع وشراء میں باستثناء شاذ ونادر کوئی جانتا تک بھی نہیں کہ اس کے متعلق شریعت میں کچھ احکام بھی ہیں۔ ریل میں بے ٹکٹ سفر کرنے کو حرج نہیں سمجھتے۔ اور جو ٹکٹ لیتے ہیں تو قانون سے زائد اسباب (۳) لے جانے کو برا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ریل حق العبد ہے۔ جب ہم نے اس کو استعمال کیا ہے تو ہمیں اس کا حق معہودہ (۴) کرایہ بھی دینا چاہیئے اسی طرح مدارس اور انجمنوں کے چندے بھی حق العبد ہیں

(۱) بندہ ہوجانا ہے (۲) کرایہ اور خرید وفروخت کے معاملات (۳) سامان (۴) اس کا مقررہ حق یعنی کرایہ۔

اس کی تحصیل میں جبر کی کچھ پروانہیں کرتے۔ بلکہ قصداً زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں تا کہ زیادہ چندہ وصول ہو۔ اسی طرح کل معاملات میں سخت بے پروائی ہے۔ چنانچہ اس کی کھلی دلیل ہے کہ جس طرح نماز روزہ میں علماء سے پوچھتے ہیں معاملات میں کبھی نہیں پوچھتے۔ رہن نامہ بیعانامہ کی دستاویز لکھ کر وکیل کو تو دکھلائیں گے کہ قانون حکومت کے خلاف تو نہیں مگر کسی عالم کو کبھی نہیں دکھائیں گے کہ قانون شرعی کے تو خلاف نہیں اسی طرح مقدمہ میں جھوٹ بولنا کہ اس میں علماء سے بالکل نہیں پوچھیں گے کیونکہ یہ عام طور پر معلوم ہے لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ''اللہ کی جھوٹوں پر لعنت ہے'' اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ پوچھنے پر یہی فتویٰ ملے گا تو پوچھ کر خود کیوں لعنت سنیں۔

لطیفہ

اپنے فعل پر لعنت سننے سے عرب کے ایک معلم کا قصہ یاد آیا۔ کہ ایک لڑکا استاد سے قرآن کا سبق لے رہا تھا اور استاد کی طرف منہ کر کر کے اس آیت کا تکرار کر رہا تھا وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنَ ۔وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنَ ''قیامت تک تجھ پر اللہ کی لعنت ہے'' استاد اس ہیئت خطاب سے جھنجھلا گیا اور کہا اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ وَعَلٰى وَالِدَيْكَ ''تجھ پر لعنت ہو اور تیرے ماں باپ پر بھی'' لڑکا سمجھا کہ آیت یونہی ہوگی اس نے یوں ہی کہنا شروع کر دیا وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ وَعَلٰى وَالِدَيْكَ ''تجھ پر لعنت ہو اور تیرے ماں باپ پر بھی''۔

علماء سے ملاقات کا فائدہ

غرض جھوٹ بولنے کی نسبت علماء سے نہیں پوچھیں گے میں کہتا ہوں کہ پوچھا تو ہوتا شاید اجازت ہی مل جاتی اور گو بات تو کہنے کی نہ تھی مگر کیا کروں اس کے کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ بعض جگہ جھوٹ بولنا بھی جائز ہے۔ تم پوچھ کے تو

دیکھو معلوم ہوگا کہ کہاں کہاں جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل میں اس وقت نہیں بتا سکتا کیونکہ میں اس وقت فقہ کی کتاب تھوڑا ہی لکھ رہا ہوں۔ مگر اس اجمال کے بعد اتنا ضرور کہوں گا کہ علماء سے وحشت مت کرو اور یہ بدگمانی مت کرو کہ وہ ہر جھوٹ کو حرام ہی کہیں گے اسی سے تو لوگ درویشوں کو اچھا سمجھتے ہیں کہ کسی کو روکتے ٹوکتے نہیں شفقت سے کسی کو بچہ کہدیا اور کسی کو باوا بنادیا۔ مگر بشارت دیتا ہوں کہ آجکل تو نوعمر مولوی بھی اسی طرح کا برتاؤ کرنے لگے ہیں۔ کہ باوجود یہ کہ وہ آپ کی سب بیہودہ حالت سمجھتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے۔ مثلاً میں کسی کی ڈاڑھی مونڈی ہوئی دیکھتا ہوں مگر کہنا دل شکنی سمجھتا ہوں۔ تو آپ اس زمانہ کے نوعمر تہذیب دیدہ مولویوں کے پاس جایئے اور نوعمر کے یہ معنی نہیں کہ وہ آپ سے بھی زیادہ نوعمر ہوں۔ اس وصف میں تو آپ ہی بڑھے ہوئے ہیں۔

نوشیرواں کی فراست

جیسے نوشیرواں سے کسی نے شکایت کی کہ فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا تو نوشیرواں نے کہا کہ تو کوتاہ قامت ہے(۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص کوتاہ قامت پر ظلم کر سکے وہ خود متنفی(۲) ہوتا ہے اس نے کہا اجی جس نے مجھ پر ظلم کیا وہ مجھ سے زیادہ کوتاہ قامت ہے۔ چنانچہ تحقیقات سے ایسا ہی نکلا۔

نوعمر علماء سے ملاقات کا فائدہ

بلکہ نوعمر کا مطلب یہ ہے کہ بہت پرانے مولویوں کے سامنے جو نوعمر ہوں گے وہ تسامح کریں گے تو اخلاقاً وہ بھی درویش ہی ہیں وہ آپ کی بہت خاطر کریں گے۔ تہذیب کے ساتھ پیش آویں گے یہاں تک کہ آپ کے دل میں

(۱) پست قد (۲) دوسرے کو ہلاک کرنے والا۔

ان کی محبت پیدا ہوگی تو آپ خود ڈاڑھی رکھ لیں گے کیونکہ ان کے اخلاق دیکھ کر پھر آپ منڈواتے ہوئے خود شرمائیں گے مگر ان کو سن کر ڈر مت جانا کہ بس جی اگر مولویوں سے ملنے میں یہ خاصیت ہے کہ خود بخود ڈاڑھی رکھ لیتا ہے تو ہم ملیں ہی گے نہیں۔ جیسے کسی نے کہا تھا کہ چاند دیکھ کے روزہ فرض ہوجاتا ہے۔ دوسرے نے کہا میں دیکھوں گا نہیں جو فرض ہو۔ مگر صاحب جب مولوی آپ سے ڈاڑھی کی بات کچھ نہ کہیں بلکہ آپ بدون (۱) کہے خود ہی رکھ لیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ جبکہ آپ بلاکلفت (۲) ڈاڑھی رکھ لیں پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بہرحال آپ علماء سے ضرور ملئے اور ہر بات کو ضرور پوچھئے۔

سوال کرنے کا فائدہ

بلکہ میں تو علی سبیل الترقی (۳) کہتا ہوں کہ اگر عمل نہ بھی کرنا ہو تب بھی پوچھئے کیونکہ اگر مسئلہ بھی نہ معلوم ہوا تو ایک تو ترک علم کا گناہ ہوا اور ایک ترک عمل کا تو اس میں ایک یہی فائدہ ہوگا کہ تحصیل علم کا فرض تو ادا ہوجائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کبھی توفیق عمل کی ہوگئی تو علم اپنے پاس ہوگا جیسے کسی کو خارش ہو اور وہ نسخہ کا ایک جزو گندھک سونگھے اور بدبودار سمجھ کے نسخہ ہی نہ سنے یہ اس کی غلطی ہے کم از کم نسخہ تو معلوم کرلے کہ اگر کبھی علاج کو جی چاہے تو اس وقت طبیب کو تو ڈھونڈنا نہ پڑے گا۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ علم کی خاصیت خشیت ہے (۴)۔ امام غزالی نے ایک بزرگ کا مقولہ لکھا ہے کہ ہم نے علم اور اغراض سے سیکھا تھا کہ تحصیل علم کے بعد قاضی بنیں گے مفتی بنیں گے مگر علم نے ہمیں چھوڑا نہیں اور وہ ہمیں اللہ ہی کا بنا کے رہا تو علم کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی خشیت پیدا ہو ہی جاتی ہے تو علماء سے احکام ضرور پوچھ لیا کرو اور ہر امر کے متعلق پوچھا کرو مثلاً مقدمہ

(۱) بغیر کہے (۲) مشقت (۳) اس سے بھی بڑھ کر یہ کہتا ہوں (۴) خوف خدا۔

عدالت میں لے جانا ہو تو بھی علماء سے پوچھ لیں۔ جب آپ ہر بات کو پوچھیں گے اس وقت آپ کا یہ گمان کہ علماء سے صرف لَا یَجُوْز ''یہ جائز نہیں'' کا سبق پڑھا ہے غلط ثابت ہوگا۔ بہرحال معاملات سے آجکل اتنی بے فکری ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو دین میں داخل ہی نہیں سمجھتے۔

قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیمات

اور اگر کوئی پوچھنے کو کہے بھی تو کہتے ہیں کہ مولویوں کو اس سے کیا بحث، ان کا کام نماز روزہ کا بتلانا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ خیال بالکل ہی غلط ہے۔ قرآن وحدیث وفقہ میں سب چیزوں کی تعلیم موجود ہے۔ معاملات کی بھی، معاشرت کی بھی لیکن معاشرت کو معاملات سے بھی زیادہ دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ کہ لباس پہنیں گے دوسری اقوام کا سا باتیں کریں گے تو انہیں کہ زبان یا انہیں کے لب ولہجہ میں حتیٰ کہ کمرہ بھی سجائیں گے تو اسی طرح جن کے معنی یہ ہوئے کہ ہم معاشرت میں دریوزہ گر ہیں[۱] دوسری قوموں کے اور گویا اس کا اقرار ہے اور نہایت گندہ اقرار ہے کہ ہمیں اس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں دی۔ حالانکہ ان قوموں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم سے معاشرت کا طریقہ سیکھا ہے۔ مگر آپ کی تو وہ حالت ہے ۔

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانوئے عیاں در قعر آب از عطش وز جوع گشستی خراب[۲]

یعنی سر پر ٹوکرا روٹیوں کا اور پیروں کے نیچے اتنا پانی کہ تو سارے شہر کو سیراب

---

(۱) گداگر (۲) ''تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا رکھا ہے تو ایک روٹی کے ٹکڑے کو در بدر مارا پھرتا ہے۔ تو زانو تک نہر میں کھڑا ہوا ہے اور پیاس اور بھوک سے خراب ہو رہا ہے''۔

کردے مگر عادت تو پڑگئی ہے بھیک مانگنے کی۔اس لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔

بھکاری کا حال

جیسے ایک چلتی پھرتی عورت کی حکایت ہے کہ بھیک مانگتی پھرتی تھی مگر تھی حسین، بادشاہ کو پسند آ گئی۔ اپنے ساتھ لے گیا مگر تھوڑے دنوں میں دُبلی ہوگئی بادشاہ کو تعجب ہوا کہ اس عیش وعشرت میں دُبلا ہونے کے کیا معنی اس سے بھی پوچھا کہنے لگی میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھاسکتی مجھے کھانا الگ دے دیا کیجئے خیر بادشاہ نے ایسا ہی کیا تو تروتازہ ہونا شروع ہوئی۔ بادشاہ نے ماماؤں سے کہا کہ یہ کیا کھاتی ہے انہوں نے کہا ہمارے سامنے تو کھاتی نہیں کھانا رکھوا کر ہم کو رخصت کردیتی ہے اور کمرہ بند کرلیتی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ روشندان میں سے دیکھو کہ کیا کرتی ہے۔ جب ماما کھانا رکھ کر چلی گئی تو اس نے حسب معمول دروازہ بند کرلیا۔ اب روشن دان میں سے جھانک کے دیکھا تو اُس نے یہ کیا کہ روٹی تو ایک طاق میں رکھی اور پیالہ دوسرے طاق میں اور رکابی تیسرے طاق میں۔ اور ایک طاق کے پاس گئی اور کہا کہ اللہ کے واسطے ایک ٹکڑا دے دے۔ بس ایک لقمہ کھالیا۔ پھر دوسرے طاق کے پاس گئی اور اسی طرح کہا پھر ایک لقمہ کھالیا بس اسی طرح سارا کھانا کھالیا، بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا تو فوراً اُسے نکالا کہ کمبخت اب بھی بھیک کی عادت نہ گئی۔

ہماری حالت زار

واللہ مجھے بہت افسوس ہے کہ یہی حالت ہماری ہے کہ اپنے یہاں کی دولتیں ناپسند اور دوسروں کے یہاں کی مانگی ہوئی بھیک پسند۔کوئی کام ہندو کرنے لگیں یہ بھی ان کی دیکھا دیکھی کھڑے ہوجائینگے عیسائیوں کو کچھ کرتے دیکھیں گے

ان کی حرص میں یہ بھی کرنے لگیں گے۔ اور پھر تقلید بھی کریں گے تو کورانہ۔ بے سمجھے پھر اس میں بھی استقلال نہیں کہ چار دن میں بیٹھ رہیں گے۔ حالانکہ دوسری قومیں جو کام کرتی ہیں نباہ کر کرتی ہیں۔

معاشرت کی تعلیم

غرض معاشرت بھی جز و دین ہے اس کو بھی اپنے ہی گھر سے سیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب کوئی رواج ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا میں بطور مثال کے ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا ہے کہ اگر تین آدمی ہوں دو آدمیوں کو تیسرے سے جدا ہو کے سرگوشی کی اجازت نہیں۔ سلف کا دستور یہ تھا کہ ایسے موقع پر جب چوتھا آدمی آجاتا تب ان میں سے دو اٹھ کے سرگوشی کر لیتے تا کہ تیسرے کی دل شکنی نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کسی مذہب میں بھی ایسا قانون ہے۔ بھلا کوئی اس کی نظیر دکھلا تو دے۔ آج کسی تمدن میں بھی ایسے قانون کا پتہ نہیں واقعی جو اصول اسلام نے سکھلائے ہیں وہ کسی قوم میں بھی نہیں۔ میں تو دوسری اقوام کے سامنے اپنے بزرگان دین کو پیش کر کے یہ کہوں گا ؎

أُولٰئِكَ آبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ　　اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ (۱)

بھلا کوئی لا سکتا ہے ایسے اصول بس ہمیں تو وہی معاشرت چاہیئے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور گو وہ ظاہر میں شان دار نہ ہو تو نہ ہو مگر واللہ ہیبت اصلی اس میں ہے۔ بقول مولانا ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست　　ہیبتے از صاحب ایں دلق نیست

یہ شعر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصے میں ہے کہ ان کو سفیر روم نے اینٹ پر سر رکھ کر سوتے دیکھا تھا اور اسی حالت میں جب چہرہ مبارک پر نظر پڑی تو

(۱) ''یہ ہیں ہمارے آباء (بزرگ) تو اے جریر ان کی مثل تو ہمارے پاس لا جبکہ ہم مجمعوں کو جمع کریں''۔

مارے رعب کے کانپ اُٹھا۔ اس پر سخت متعجب ہوا اور یہ فیصلہ کیا کہ بے شک یہ شخص حق پر ہے اور یہ حق ہی کی ہیبت ہے ۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبتے از صاحب ایں دلق نیست (۱)

اب بھی دیکھ لیجئے کہ جس شخص کو اللہ سے جتنا تعلق ہوتا ہے قلوب میں اتنی ہی ہیبت زیادہ ہوتی ہے کہ بادشاہ سے بھی نہیں ہوتی اور اس ہیبت کے ساتھ ہی اس کی محبت بھی بے حد ہوتی ہے۔ بہرحال یہ تو ہماری روزمرہ کی معاشرت کا حال ہے۔ پھر شادی بیاہ میں اور غمی کی رسموں میں تو شریعت سے استفتاء کون کرے یہ تو گویا ہماری قومی باتیں ہیں، شریعت کو ان سے کیا غرض نعوذ باللہ۔ اسی لئے ان رسموں میں وہ روپیہ اڑتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

جاہلانہ رسم ورواج

ہمارے اطراف میں کیرانہ ایک قصبہ ہے وہاں کا قصہ ہے کہ ایک گوجر بیمار ہوا۔ اس کا بیٹا حکیم کے پاس آیا اور کہنے لگا اجی حکیم جی جس طرح ہو اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کردو۔ کیونکہ چاول بہت مہنگے ہیں، برادری کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ مجھ کو باپ کے مرنے کا تو غم نہیں ہے صرف برادری کو کھلانے کی فکر ہے۔ کس قدر معاشرت بگڑی ہے۔ اسی طرح خود ہمارے قصبہ کا واقعہ ہے کہ ایک ساس مرگئی تو بہو بیٹھی رورہی تھی کہ کفن دفن تو کسی طرح چندہ خیرات سے ہو ہی جائے گا مگر آٹھ آنے کے پان برادری کے لئے کہاں سے لاؤں، جب میں نے سنا تو اپنے گھر میں کہا کہ گو ایسے موقع پر رسماً جانا جائز نہیں اور تم کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو۔ مگر خدا کے لئے جس کے گھر میت ہو وہاں ضرور جایا کرو اور جا کے پان دان پر قبضہ کرلیا کرو۔ اور کسی کو پان نہ کھانے دو۔ یہ کہاں کی مصیبت ہے۔ چنانچہ انہوں نے جب سے ایسا کیا۔ الحمدللہ ہمارے یہاں سے تو یہ رواج اُٹھ گیا۔ کیوں

(۱) ’’یہ ہیبت حق کی ہے خلق کی نہیں ہے کچھ ہیبت صاحب دلق کی نہیں ہے‘‘۔

صاحب یہی معنی ہیں دین کے اس طرح پرایا مال کھاجایا کرو۔

تعلیم اخلاق

اس وقت بہت وقت ہوگیا ہے اس لئے میں پانچواں جزو یعنی اخلاق کے بیان پر ختم کردوں گا۔ اوّل یہ سمجھئے کہ اخلاق کیا چیز ہیں اس کی حقیقت ہے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اس کا تو کہیں نام ونشان بھی نہیں رہا۔ بس مرید ہوگئے اور عقیدہ پکا لیا کہ پیر اللہ میاں کے یہاں بخشوائیں گے۔ ادھر پیر روٹیوں سے مطمئن ہوگئے کہ اب سلسلہ میں تو آ ہی گیا پھر کیا غم گویا ایک خاندانی رسم ورواج بن گیا ہے۔ چنانچہ بعض اطراف میں یہ قاعدہ ہوگیا ہے کہ اگر ایک خاندان کا ایک شخص کسی کا مرید ہوگیا تو اب سارے خاندان کو اسی کا مرید ہونا ضروری ہے۔ پھر ان کی اولاد کو اس پیر کی اولاد کا مرید ہونا ضروری ہے گو اہلیت کا نام ونشان بھی نہ ہو تو بجز گمراہ کرنے کے اس مشیخت (۱) کا کیا نتیجہ ہے۔

جاہل پیر

ایک ایسے ہی گمراہ کن پیر جی کا قصہ یاد آگیا کہ مریدوں کے گھر گوجروں کے کسی گاؤں میں پہنچے کچھ دُبلے ہورہے تھے ایک گوجر مرید نے پوچھا پیر جی دُبلے کیوں ہورہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ کم بختوں تم لوگ نہ نماز پڑھتے ہو نہ روزہ رکھتے ہو تمہارے بدلہ مجھ ہی کو روزہ نماز کرنا پڑتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ بھی فکر کہ تم سب کے بدلے مجھ ہی کو پل صراط پر چلنا پڑتا ہے پھر بتلاؤ دبلا ہوں یا نہ ہو مرید بڑا خوش ہوا کہ واقعی پیر جی ہماری طرف سے بڑی محنت کرتے ہیں۔ خوش ہو کے کہنے لگا کہ جا فلانا کھیت وہاں کا تم کو دے دیا۔ پیر جی تھے ہوشیار کہا چل کے قبضہ کرادے۔ اب یہ بڑے خوش کہ اچھا احمق پھنسا دھانوں کے کھیت میں پانی تو بہت

(۱) ایسی پیری کس کام کی۔

ہوتا ہے اور مینڈ ذرا پتلی ہوتی ہے جس کو عادت نہ ہو وہ اس پر سے نہیں گذر سکتا۔ پیر جی اس پر سے چلے تو پیر لڑکھڑایا اور کھیت میں جا رہا(۱)۔ مرید نے جو پیر جی کو گرتے دیکھا تو اوپر سے ایک لات دی(۲) کہ تو بڑا جھوٹا ہے جب اتنے چوڑے راستہ پر نہیں چل سکا تو پلصراط پر کیا چلے گا جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے جا ہم کھیت نہیں دیتے۔ اب پیر جی کو کچھ تو گرنے کا کھسیان پن اور کچھ لات کی چوٹ اور کچھ کھیت نہ ملنے کا غم بیچارے کا بہت ہی بُرا حال ہوا۔ غضب تو یہ ہے کہ ایسے جھوٹوں نے سچوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے تو اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جسے رہبر محقق مل جائے وہ رہبر کسی کے بتانے سے نہ بناؤ بلکہ علامات سے خود منتخب کرو۔

صحیح پیر کی علامات

اور چند علامتیں ہیں بس انہیں سمجھ لے اس کے بعد انتخاب آسان ہو جائے گا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ اُسے علم دین ہے یا نہیں۔ اور یہ ضرور نہیں کہ وہ عربی ہی جانتا ہو۔ چاہے اردو فارسی ہی جانتا ہو یا یہ بھی نہ جانتا ہو۔ مگر بقدر حاجت دین کے احکام سے واقف ہو مگر یہ اس کا مطلب بھی نہیں کہ صرف راہ نجات ہرنی کے قصہ ہی کا عالم ہو۔ بلکہ عقائد و دیانیات۔ معاملات۔ معاشرات۔ اخلاق سب شعبوں کو اچھی طرح جانتا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے یا نہیں۔ سو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ چند روز اس کے پاس رہ کر دیکھو کہ ہر امر میں اپنی معلومات سے مریدوں کی اصلاح کرتا ہے یا نہیں۔ اور اگر پاس نہ رہ سکو تو وقتاً فوقتاً خط و کتابت سے پوچھتے رہو اگر اسے ضروری مسائل بھی معلوم نہ ہوں تو اس کو تو چھوڑ دو دوسرے کی تلاش کرو۔ اور دوسری علامت یہ

(۱) کھیت میں گر پڑے (۲) ایک لات ماری۔

ہے کہ وہ خود بھی شریعت پر عامل ہو۔ تیسری علامت یہ ہے کہ اُسے عادت ہو طالبین کو امر و نہی کرنے کی سختی سے یا نرمی سے۔ چوتھی یہ کہ اس کی صحبت میں روز بروز حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہو اور دنیا کی محبت گھٹتی ہو۔ پانچویں علامت یہ ہے کہ بزرگوں سے سنی ہے کہ اس کی طرف عوام واہل دنیا کا رجحان کم ہو اور اہل علم واہل فہم وصلحا کا رجحان زیادہ ہو۔ اور جس کی طرف عوام اور دنیاداروں کا رجحان زیادہ ہو وہ کامل نہیں ہے۔

پس جس میں یہ پانچوں علامتیں مل جاویں اُسے غنیمت سمجھنا چاہیئے ۔ اس کا اتباع مطلق کرنا چاہیئے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے حکم کا منتظر رہے۔ بلکہ خود بھی پوچھتا رہے۔

اطلاع واتباع کا اہتمام

مثلاً یہ دیکھے کہ میرے اندر تکبر ہے اور اس کا علاج پوچھے کینہ ہے علاج پوچھے۔ غصہ ہے، غیبت کی عادت ہے ان کا علاج پوچھے یا مال کی محبت ہے کہ فقیر کو دیتے ہوئے دم نکلتا ہے اس کا علاج پوچھے کیونکہ باطنی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو اس لئے سب کو پوچھنا چاہیئے اور جو نہیں پوچھتا وہ گویا اپنے کو بیمار نہیں سمجھتا۔ یہ علامتیں اس لئے میں نے بتادیں کہ بہت سے پیر بھی ایسے ہیں کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بربا یزید ۔۔۔ وزدرونت ننگ میدارد یزید(۱)

مشائخ کو اپنی فکر بھی کرنی چاہیئے

اور ان امراض کے علاج سے جیسا مریدوں کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے شیوخ بھی بے فکر نہ رہیں اس لئے کہ جس طرح ہم بیمار ہیں اسی طرح بعض اوقات شیوخ

(۱) ''باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر خدائے عزوجل کا عذاب ہو رہا ہے۔ باہر سے تو بایزید بسطامی رحمہ اللہ جیسے پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے''۔

بھی بیمار ہوجاتے ہیں اور اس میں تعجب ہی کیا ہے کیا حکیم بیمار نہیں ہوتے بلکہ یہ تو ایسے بیمار ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی طب کے گھمنڈ پر بد پرہیزی بہت کرتے ہیں۔ اسی طرح شیوخ ہیں کہ ان کی بیماری عوام سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ان کے واسطے علاج کی صرف یہ صورت ہے کہ یہ بزرگوں کی کتابیں دیکھیں اور ان سے اپنا علاج کریں۔ اور یہ کتابیں مبتدی کو تو کافی نہیں ہوتیں مگر منتہی کو کافی ہوجاتی ہیں کیونکہ وہ فن جانتا ہے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے جسے اہل دیکھیں اس سے رجوع کرے۔

شیخ کامل کی علامت

ایک علامت شیخ کامل کی یہ بھی ہے کہ یہ دیکھے کہ اس کے پاس بیٹھنے والوں میں اکثر کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر اکثر کی حالت بہتر ہو تو وہ شیخ کامل ہے گو سب کی نہ ہو کیونکہ لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ ''اکثر کے لئے کل کا حکم ہے'' اور اکثر کی خراب ہو اور ایک آدھ کی اچھی ہو تو وہ شیخ کامل نہیں اس سے ہرگز رجوع نہ کرے ورنہ یہ بھی ناقص ہی رہے گا کیونکہ جب پیر میں کمال نہیں اس میں کہاں سے آجائے گا۔ ایسا ہی ہوگا۔ جیسے ایک مرید نے کہا تھا۔ ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے رامپور وہاں کا ایک شخص کسی پیر کا مرید ہوگیا۔ اس سے کسی نے پوچھا میاں کچھ ملا بھی۔ تو اس نے کہا کہ میاں جب سقاوہ(۱) ہی میں کچھ نہ ہو تو بدھنی(۲) میں کہاں سے آوے اور واقعی جب پیر ہی کی حالت درست نہیں ہے تو بیچارے مرید کی کب اصلاح ہوگی۔ غرض جس کے مریدوں میں اکثر کی حالت درست ہو وہ کامل ہے یہ علامت دیکھ کر تب اس سے اصلاح کا تعلق کرے۔

---

(۱) پانی کی ٹنکی ہی میں کچھ نہ ہو (۲) لوٹے میں کہاں سے آئے گا۔

ضروری تنبیہ

اور اس کے متعلق ایک اور ضروری تنبیہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر اس میں سب علامات ہیں اور اس کی تعلیم وصحت سے اکثر کی حالت درست بھی ہے مگر خود اس مرید کی حالت درست نہیں ہوتی تو اس سے یہ تو نہ سمجھے شیخ کامل نہیں ہے لیکن شیخ سے اپنی حالت کا ذکر کرتا رہے۔ اور جب ایک معتد بہ مدت گذرنے پر بھی حالت درست نہ ہو تو بدگمانی تو جب بھی نہ کرے لیکن اس وقت یہ سمجھے کہ مجھے اس سے مناسبت نہیں ہے پھر کوئی اور مناسبت کی جگہ تلاش کرے اور شیخ سے بھی کہدے۔ اگر شیخ محقق ہے تو وہ فوراً دوسرے سے رجوع[۱] کرنے کی اجازت دیدے گا۔ اور اگر دوکان دار ہے تو مکدر ہوگا[۲]۔ تو اس حالت میں وہ واجب الاتباع بھی نہیں۔ دوکاندار کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے طالب کی کتنی ہی پریشانی وناکامی بڑھ جاوے مگر یوں کبھی نہ کہیں گے کہ میں تمہارے لئے کافی نہیں اور اس سے رجوع کرو۔ جیسے مدعی طماع طبیب[۳] کہ چاہے مریض مر ہی جاوے مگر اپنے علاج کے قاصر ہونے کا کبھی اقرار نہ کریں گے۔

جاہل حکیم

جیسے ایک جاہل حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے کسی مریض کو بڑا سخت مسہل[۴] دیدیا تھا۔ تیماردار نے خبر دی کہ حکیم جی دست بہت آرہے ہیں کہا آنے دو مادہ بہت ہے[۵] اچھا ہے نکل جاوے۔ جب اور زیادتی ہوئی پھر اطلاع کی گئی۔ پھر یہی جواب ملا۔ غرض بار بار اطلاع ہوتی رہی اور حکیم جی یہی کہتے رہے کہ مادہ سخت ہے نکلنے دو۔ یہاں تک کہ ضعف کے مارے مریض کا دم نکل گیا[۶]۔ اس کی بھی اطلاع ہوئی تو حکیم جی کیا کہتے ہیں اللہ رے مادے[۷] جس کے نکلنے سے مر گیا خدا

---

(۱) تعلق اصلاح قائم کرنے کی اجازت دیدے (۲) اس کا دل برا ہوگا (۳) لالچی شخص جو طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہو (۴) دست آور تیز دوا دیدی (۵) جسم میں فاسد مادہ بہت ہے (۶) انتقال ہوگیا (۷) یعنی اتنا فاسد مادہ نکلنے کے بعد بھی مر گیا۔

جانے رہتا تو کیا ہوتا۔ ارے منحوس مرنے کے بعد اور کیا ہوتا شاید دوزخی بنادیتا۔ تو حضرت ایسے ہی بعضے طبیب روحانی بھی ہوتے ہیں محض اناڑی۔

جاہل پیر

جیسے دہلی میں کسی پیر نے ایک مرید کو حبس دم (۱) بتایا تھا۔ اب اُسے تکلیف ہوئی اس نے اطلاع کی کہا کئے جا مجاہدہ میں تو تکلیف ہوتی ہی ہے یہاں تک کہ اس غریب کا دم نکل گیا تو کہا چلو شہید ہوا۔ میں کہتا ہوں بیشک۔ مگر خبر بھی ہے کہ شہید وہ ہوتا ہے جسے کوئی ظالم قتل کرے تو یہ پیر ظالم ہوا۔ اسی لئے اس طریق میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے جلدی سے کسی کو پیر نہ بنانا چاہیئے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست (۲)

ایک اور جگہ علامات کے اسباب میں فرماتے ہیں ؎

کار مرداں روشنی وگرمی ست کاردوناحیلہ وبے شرمی ست (۳)

روشنی سے مراد معرفت اور گرمی سے مراد محبت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس میں معرفت اور محبت کامل ہو اس کو شیخ بناؤ۔ اور معرفت کے لوازم میں سے ایک یہ امر بھی ہوگا کہ اگر کسی عارض کے سبب اس سے نفع نہ ہو مرید کو دوسری جگہ جانے کو فوراً کہدے گا ورنہ بیچارہ مرید ہی میں دس کھوٹ نکال کر حیلہ بہانہ کردے گا۔

شیخ کامل کی شان

ایک شیخ کامل محقق کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہمارے دادا پیر حضرت میانجی صاحب سے کاندھلہ کے ایک عالم بیعت ہوئے جو پہلے مخالف تھے پھر موافق ہوگئے تھے۔ اور مخالفت کے زمانہ میں حضرت میانجی صاحب کی شان میں گستاخی

(۱) سانس روکنے کا مجاہدہ (۲) ''آدمیوں کی صورت میں بہت سے شیطان بھی ہیں یعنی دھوکہ باز پیر پس ہر شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے یعنی مرید نہ ہونا چاہیئے'' (۳) ''مردان حق کا کام روشنی وگرمی یعنی محبت اور معرفت ہے۔ کمینوں یعنی دھوکہ باز پیروں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے''۔

کیا کرتے تھے۔ میانجی صاحب نے بیعت تو کرلیا اور طریق کی تعلیم بھی شروع کی۔ مگر چند رز کے بعد خود ہی فرمادیا کہ مولانا اس طریق کی بنا محض صدق وخلوص پر ہے۔ اس لئے میں بے تکلف کہتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفع نہ ہوگا جس وقت میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اسی وقت آپ کے وہ پچھلے کلمات دیوار آہنی بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ آپ کسی دوسرے سے رجوع فرماویں اور میں دعا کرتا ہوں۔ آج کل خود تو کیا کسی دوسرے کے پاس بھیجیں گے۔ اگر کوئی خود سے بھی چلا جائے تو اس قدر ناراض ہوتے ہیں کہ گویا مرتد ہوگیا۔ تو شیخ محقق کی یہ شان ہوتی ہے۔

طالب صادق بنو

غرض جب شیخ کا انتخاب کر چکے جس کی یہ علامات ہیں جو مذکور ہوئیں تو اب اس کا کامل اتباع کرے کہ جو وہ کہے وہ کرے اور جو مرض وہ بتائے اس کا علاج کرے اور خود سے بھی اپنے امراض کا اظہار کرتا رہے اس بھروسہ پر نہ رہے کہ شیخ کو خود کشف سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ اول تو یہ ضروری نہیں دوسرے جب طبیب سے مزید اطمینان کے لئے نبض وقارورہ(۱) دکھادینے کے بعد بھی حال بیان کرتے ہیں تو یہاں بھی ایسا ہی کرو یہ بھی تو طبیب روحانی ہے۔

تیسرے مانا کہ بغیر کہے پیر کو انکشاف ہی ہوگیا ہو مگر بغیر کہے اُسے آپ کی طلب کیسے معلوم ہوگی۔ بغیر طلب کے تو حق تعالیٰ بھی متوجہ نہیں ہوتے اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ ''کیا اس کو تمہارے گلے منڈھ دیں اور تم اس سے نفرت کئے جاؤ''، یعنی اگر تم ایک مرتبہ ہماری رحمت سے بھاگتے ہو تو جاؤ ہم ہزار دفعہ مستغنی ہیں اور طالب کے لئے یہ وعدہ ہے۔(مَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعاً تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا)(۲) تو طالب خود اس قدر متوجہ ہوتے ہیں کہ

(۱) پیشاب (۲) ''جو شخص میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز آتا ہوں اور جو شخص میری طرف ایک گز آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع (دونوں ہاتھ آتا ہوں)''۔

اس کی ذراسی حرکت پر وہ خود برسوں کی مسافت طے کردیتے ہیں۔

طلب کی ترغیب

اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالاؤ پست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں(۱)

حضرت فریدالدین عطار فرماتے ہیں ؎

گر تو ہستی طالب حق مرد راہ درد خواہ ودرد خواہ ودرد خواہ(۲)

پھر مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجارود ہر کجا مشکل جواب آنجارود
ہر کجا دردے دوا آنجارود ہر کجا رنجے شفا آنجارود(۳)

اور فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں رایک زمانے خاک باش(۴)

ان سب میں طلب ہی کی ترغیب ہے کہ تم خود بھی تو طلب ظاہر کرو۔ ایک شخص کے متعلق حاکم چاہتا ہے کہ اُسے تحصیلدار کردے۔ مگر چاہتا یہ ہے کہ یہ بھی تو منہ سے کہے۔ وجہ یہ کہ اگر یوں ہی مل جائے گی تو قدر نہیں کرے گا ؎

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

تو اگر شیخ صاحب کو کشف بھی ہو تب بھی آپ کی طرف سے بھی تو طلب

---

(۱) ''پانی کو کم تلاش کرو پیاس پیدا کرو تاکہ تمہارے لئے پانی بلندی اور پستی سے جوش مارے پیاسے اگر پانی تلاش کرتے ہیں جہاں میں پانی بھی ڈھونڈھتا ہے پیاسوں کو دنیا میں'' (۲) ''اگر تو طلب مرد سالک ہے تو دردِ عشق طلب کر دردِ عشق طلب کر'' (۳) ''جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہیں جاتا ہے جس جگہ مشکل ہوتی ہے جواب وہیں دیا جاتا ہے جہاں مرض ہوتا ہے وہیں شفا پہنچتی ہے۔ جہاں بیماری ہوتی ہے وہیں دوا دی جاتی ہے'' (۴) ''برسوں تک تو دل خراش پتھر تم بنے رہے آزمائش کے لئے ایک زمانہ خاک بن کر دیکھو''۔

ہو۔ جب طلب ہوگی تب ہی عنایت ہوگی۔

فقیری کی تعریف

یہی اصلاح اخلاق فقیری ہے۔ طریق حق جس کے لئے لوگوں نے ایک الگ جماعت تجویز کررکھی ہے اور جس کی تعریف یہ گھڑ رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کام سے تعلق نہ ہو حالانکہ اس فقیری کی یہ تعریف ہے۔ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ یعنی اللہ سے ایسا ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے حَقَّ تُقَاتِہٖ کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ یُطَاعُ وَلَا یُعْصٰی۔ یُطَاعُ کے معنی ہیں اطاعت کیا جاوے یہ طوع سے ماخوذ ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت اور خوشی کو تو اطاعت خوشی سے کہنا ماننا ہوا۔ اب سچ کہو کہ کیا کسل کے وقت نماز رغبت سے پڑھی جاتی ہے۔ بخل کے وقت زکوٰۃ خوشی سے دی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بس اسی کی کسر ہے ہماری غلامی میں۔

اہل دل کی صحبت کا اثر

تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسا بھی درجہ ہے جس میں اعمال شرعیہ طبعیت ثانیہ بن جاویں گے کہ بے تکلف خوشی سے ادا ہونے لگیں۔ اور یہ ہے وہ درجہ جو کنز وہدایہ(۱) میں نہ ملے گا۔ بلکہ وہ اس طرح ملے گا۔

قال را بگذارومرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو(۲)
گر تو سنگ خارۂ مرمر شوی چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی(۳)

یہ انہیں اہل دل کی صحبت کا اثر ہے کہ پتھر کو گوہر بنادیتے ہیں۔ اس دولت کی تحصیل کے لئے ان کا اتباع ضروری ہے وہی دل کی اصلاح کرتے ہیں جس کے متعلق ارشاد ہے: اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ (۴)۔ اور جب اصلاح

(۱) فقہ کی دو کتابوں کے نام (۲) ''قال کو چھوڑ و حال کو پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جاکر پڑجاؤ'' (۳) ''اگر تو سخت پتھر مرمر بھی ہو جب کسی اہلِ دل کے پاس پہنچے گوہر ہوجائے'' (۴) ''جب وہ درست ہو تو تمام جسم درست ہوجاتا ہے'' الحدیث۔

قلب پر تمام تر اصلاح موقوف ہے۔ تو اس کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہوگیا۔ کیا یہ حدیث اس حکم کے افادہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ یقیناً کافی ہے۔ تو اب یہ کہنا کہ اس طریق کی پیروی کرنا سب کے ذمہ فرض وواجب نہیں۔ جیسا کہ اس شعبہ کو اکثر لوگوں نے دین میں غیر ضروری قرار دے رکھا ہے۔ بالکل غلط ٹھہرا۔ لیکن اس میں دنیا کے چھوڑنے اور بیوی بچوں سے منہ موڑنے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی سے تو لوگوں کو تواحش ہوا ہے(۱)۔ اور اسی سے اس کو دین سے علیحدہ سمجھا ہے۔ سو ایسا نہیں بلکہ اسی عیش وراحت کی حالت میں طریق طے ہوسکتا ہے ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد   بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد (۲)

محققین شاہانہ لباس کے ساتھ بھی تم کو درویش بنادیں گے اور بعضوں نے جو اچھا لباس چھوڑ دیا وہ اُن کا غلبۂ حال تھا۔ جیسے بعض لوگوں کی بیوی مرجاتی ہے تو بچوں کی محبت میں دوسری بیوی نہیں کرتے اور جن پر ایسا غلبہ نہیں ہوتا وہ بوڑھے ہوکر بھی نکاح کرتے ہیں گو لوگ ان کو ہنستے بھی ہوں مگر اُن کا کیا ضرر ہے آرام تو ملے گا۔

بڑے میاں کا قصہ

ہنسنے پر ایک بڑے میاں کا قصہ یاد آیا۔ ایک نوے سال کے بوڑھے نے جوان کنواری بچی سے نکاح کیا تھا۔ رات کو ماما صاحبہ آئیں کہ لڑکے کو گھر میں بلاتی ہیں۔ ماشاء اللہ کیسے اچھے لڑکے ہیں۔ جن کی ڈاڑھی سفید گالا ہوچکی ہے کچھ دانت بھی گر چکے ہیں۔ اور ساس جن کے ابھی بال بھی سفید نہیں ہوئے وہ بڑے میاں سے کہتی ہیں۔ بیٹا میں تمہیں لونڈی دیتی ہوں۔ بیٹا کیا کہتے ہیں کہ جی اماں جان آپ یہ کیا کہتی ہیں۔ لونڈی نہیں میں تو بجائے بیٹی کے رکھوں گا۔ تو غرض جس طرح بعضے نکاح کرتے ہیں بعضے نہیں کرتے بس اسی طرح بعضے بزرگوں نے دیکھا کہ ہم خالق ومخلوق دونوں کے حقوق کو جمع نہ کرسکیں گے۔ انہوں نے تعلقات خلق کو

(۱) وحشت ہوئی (۲) ''جب فقیر لباس شاہی میں آیا تو اللہ کے بندہ کی تدبیر سے آیا''۔

چھوڑ دیا۔ ورنہ اس طریق میں فی نفسہ یہ مانع (۱) نہیں ہے۔

اصلاح باطن کی ضرورت

بس ہر شخص کے لئے ضرورت ثابت ہوئی کہ اپنے باطن کی درستی کرے اور اس کے لئے کچھ بیعت ہی کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں تو بعض دفعہ مضرت ہوجاتی ہے (۲) کہ اگر کہیں پھنس گئے تو بس بعد میں پیچ بھر رہے ہیں کہ اب تو جو ہوگیا سو ہوگیا اور ایسے بہت کم ہیں۔ جو متنبہ ہوکر اپنے کو اس ورطہ (۳) سے نکال لیں بلکہ خود پیر کو بھی متنبہ کردیں۔

پیر کی اصلاح کا انوکھا طریقہ

جیسے ایک دیندار مرید نے ایسی جرأت کی مگر لطافت کے ساتھ وہ دھوکہ میں آکر ایک دنیادار پیر کے ہاتھ میں پھنس گیا۔ اس نے چاہا کہ پیر کی حالت پیر کے کان میں ڈالے۔ چنانچہ ایک بار پیر صاحب سے کہا آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے، کہ میری انگلیاں گوہ (۴) میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی شہد میں۔ پیر نے کہا کیوں نہ ہوں تم دنیا کے کتے ہو خباثت میں بھرے ہو۔ اور ہم بحمد اللہ پاک وصاف شیریں ہیں کہا حضور ابھی خواب کا ایک جزو باقی ہے۔ وہ یہ کہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری۔ اصل میں اس نے لطافت سے یہ بات پیر کے کان میں ڈالی کہ آپ مجھ سے دنیا حاصل کررہے ہیں اور میں آپ سے دین۔

بیعت ہونے میں جلدی نہ کریں

تو بعض وقت اس طرح پھنس جاتے ہیں اس لئے بیعت میں جلدی نہیں چاہیئے پہلے خوب پیر کو اچھی طرح جانچ لے اور جانچنے کی صورت قابل اطمینان یہی

(۱) رکاوٹ (۲) نقصان ہوتا ہے (۳) اسی پریشانی (۴) پاخانے میں بھر ہوئی ہے۔

ہے کہ چندے(۱) پاس رہے بلکہ اس میں بھی اچھی صورت یہ ہے کہ اس کے وطن میں جا کر رہے۔ اور اگر پاس رہنے کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم برس دو برس خط وکتابت ہی کرے اور اس میں اپنے امراض لکھے اور ان کا علاج پوچھے جب اچھی طرح اطمینان ہو جاوے کہ نفع ہوگا تب بیعت کا بھی مضائقہ نہیں۔

خلاصہ وعظ

یہ ہے بیان شعبۂ اخلاق کا اور اسی پر اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ اور مختصر الفاظ میں تمام بیان کا خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں وہ خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کے معنی ہیں عبد شدن یعنی غلام ہو جانا ہے اور غلام اسی کو کہتے ہیں جو اپنے آقا کی تمام اوامر ونواہی میں اطاعت کرے۔ اور وہ اوامر ونواہی یہ ہیں کہ عقائد درست کیجئے، اعمال درست کیجئے۔ معاملات اور معاشرت درست کیجئے۔ اخلاق کی اصلاح کیجئے اور یہ موقوف اس پر ہے کہ علمِ دین کی کتابیں دیکھا کیجئے۔ خود بھی دیکھئے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھایئے۔ اور اپنے دیکھنے میں جہاں سمجھ میں نہ آوے کسی عالم سے تحقیق کیجئے اور کسی زندہ اہل اللہ سے تعلق رکھئے اور اس سے اپنے امراض کا علاج پوچھتے رہیئے۔ اور عمل کرتے رہیئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طور پر بہت جلد کمال دینی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس وقت آپ عبد کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ بس اب میں ختم کر چکا حق تعالیٰ سے علم وعمل اور فہم وتوفیق کی دعا کیجئے۔ فقط دعاء۔ (۲)

(۱) کچھ دن (۲) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے اور علم وعمل کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۱۲ صفر ۱۴۳۸ھ